اقبال کے حضور

سید نذیر نیازی

اقبال اکیڈمی پاکستان

۱۹۳۸ء

شنبہ: یکم جنوری

دوپہر کے قریب حاضر ہوا۔ حضرت علامہ ہلکے گلابی سے رنگ کی شال اوڑھے، تکیوں کا سہارا لیے، ملازم خانے سے باہر دھوپ میں استراحت فرما رہے تھے۔ پاس ہی علی بخش تخت پر بیٹھا چائے بنا رہا تھا۔ میں نے سلام عرض کیا اور خیریت مزاج پوچھی تو حسبِ معمول فرمایا ''الحمدللہ اچھا ہوں''۔ اتنے میں علی بخش کرسی اُٹھا لایا اور میں باادب اس پر بیٹھ گیا۔ ارشاد ہوا ''آج کیا خبر ہے؟''

میں نے کہا، خبر تو کوئی نہیں۔ اس لیے کہ حضرت علامہ کو خبروں سے دلچسپی تھی تو صرف اس حد تک کہ جنگ کب ہوتی ہے، یا پھر انھیں جستجو رہتی تو اس اَمر کی کہ 'لیگ' کی مساعی اتحاد کہاں تک کامیاب ہوئیں؛ مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار جس متحدہ محاذ کے قیام پر ہے 'یونینسٹ پارٹی' اور اس قماش کی دوسری جماعتیں اس میں کیا رکاوٹ ڈال رہی ہیں؛ ہمارے مذہبی اور نیم مذہبی فرقوں کی روش اس باب میں کیا ہے۔ شاید کچھ ایسے ہی خیالات تھے جن کے زیر اثر انھوں نے قدرے تامل کے بعد فرمایا ''یہ کس نے کہا تھا جماعتِ احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہو سکتا ہے خواہ اس کے عقاید کچھ بھی ہوں، شرط صرف یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کی بیعت کر لی جائے؟''

بظاہر یہ استفسار بڑا غیر متوقع تھا لیکن مجھے اس پر مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ اس جماعت کی سیاسی اور مذہبی روش زیر بحث تھی۔ سوال یہ تھا کہ احمدیوں کے مخصوص عقاید مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کی راہ میں کہاں تک حائل ہیں۔ حضرت علامہ مسلمانوں کو متحد دیکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کے اتحاد کی کوئی صورت تھی تو یہ کہ ان کا شعور ملی اور احساس جماعت مضبوط ہو۔ یونہی ان کا روز افزوں انتشار و ضعف و اضمحلال

دور ہوسکتا تھا اور یونہی آزادی کی اس جدوجہد میں جس سے ان کا الگ رہنا ناممکن تھا وہ کسی مرکز پر جمع ہوکر کوئی مؤثر قدم اُٹھا سکتے تھے۔ لیکن دو خطرے تھے جماعتِ احمدیہ کا اس سلسلے میں سدباب ضروری تھا۔ ایک بیرونی، یعنی لادین سیاست کا وہ ریلا جو مغربی تہذیب کے استیلا، اثر اور نفوذ کی بدولت بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور جس کی روک تھام نہ کی جاتی تو ڈر تھا کہ آزادی، اتحاد، وطنیت اور قومیت کے بظاہر بلند بانگ مگر بباطن بے روح تصورات کا فریب انھیں اپنے اس موقف سے کہ اسلام بجائے خود ایک مدار سیاست ہے منحرف نہ کردے۔ دوسرا اندرونی اور وہ مسلمانوں کی ذہنی خلفشار کہ صدیوں کے استبداد، پادشاہ گردی اور فرقہ آرائی نے انھیں یہ سمجھنے کا موقعہ ہی نہیں دیا کہ اسلام عبارت ہے جس نظام اجتماع و عمران سے اس میں ہماری اطاعت کا محور کیا ہے۔ یہ صورتِ حالات تھی جس کا حضرت علامہ کو خیال آتا تو ان کا ذہن طبعاً جماعتِ احمدیہ کی طرف منتقل ہوجاتا۔ اس لیے کہ جماعتِ احمدیہ اگرچہ اُصولاً سوادِ اعظم سے کٹ چکی تھی، بلکہ سوادِ اعظم کو سوادِ اعظم ہی نہیں مانتی تھی، لیکن مصلحتاً اس سے تعلق اور وابستگی پر بھی مصر تھی۔ بالخصوص اس وقت سے جب یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندی اسلامی سیاست کا گزر جس مرحلے سے ہو رہا ہے اور اس سے لازماً جو تبدیلیاں مترتب ہوں گی وہ بہت ممکن ہے اس جماعت کی علیحدگی پسند روش میں کچھ مشکلات پیدا کردیں۔ اسے گویا اُمت سے لاگ بھی تھا اور لگاؤ بھی۔ ایک طرف اس کی کوشش تھی کہ سوادِ اعظم سے باہر اپنا الگ تھلگ وجود قائم رکھے، دوسری جانب یہ اصرار کہ مسلمان اسے اُمت کا جز تسلیم کرلیں اور وہ بھی اس بنا پر کہ ان کے باہمی اختلافات کچھ بھی ہوں غیر مسلم تو بہر حال انھیں مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ ہم مسلمان ہیں تو اس لیے کہ ہندو اور عیسائی ہمیں مسلمان کہتے ہیں، کہ ہم ان معنوں میں مسلمان ہیں جن معنوں میں ہر مسلمان کا مسلمان ہونا اور دوسرے مسلمانوں کو مسلمان کہنا فرض ہے۔ لہٰذا جماعتِ احمدیہ کا خیال تھا کہ اور نہیں تو مشارکت اسمی ہی کی بنا پر وہ مسلمانوں سے متحد ہوسکتی ہے۔ حالانکہ یہ اتحاد کی کوئی مثبت اساس نہیں تھی، بلکہ از روے مصلحت اور موقعہ شناسی مفاہمت کی ایک وقتی اور بہ اعتبار نوعیت سلبی تجویز تاکہ اگر ہندو اور برطانوی سیاست دان اسے مسلمانوں ہی میں شامل سمجھتے رہیں تو اس خیالی یا حقیقی خطرے کا ازالہ ہوسکے جو اندریں صورت اسے درپیش تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لیے تو اس قسم کا سطحی اور بے

روح اتحاد نا قابلِ قبول تھا۔ وہ سمجھتے تھے۔ اور بجا طور پر۔ کہ مسلمانوں کا اتحاد اُمت کا اتحاد ہے، یعنی ان کی اس وحدت کا اعتراف جس کا تقاضا ہے کہ فرقوں کا آزادانہ وجود ختم ہو جائے، یہ نہیں کہ ''اُمت در اُمت'' کے عذر میں وہ ایک دوسرے سے سودے بازی کرنے لگیں، جیسا کہ سیاسی جماعتوں کا قاعدہ ہے کہ جیسا کہ جماعتِ احمدیہ اعلان کر چکی تھی کہ اس کو ''لیگ'' اور ''کانگریس'' دونوں سے الگ الگ گفت و شنید میں تامل نہ ہوگا۔ بہر حال میں نے حضرت علامہ کے استفسار پر عرض کیا کہ یہ بات میں نے بھی سنی تھی، بلکہ شاید مجھ ہی سے آپ تک پہنچی ہو۔ معلوم نہیں اُصولاً جماعت کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے لیکن ایک مرتبہ مجھے بھی اس قسم کی دعوت دی گئی تھی، بلکہ اس سلسلے میں میر افضل علی مرحوم[1] کی مثال بھی پیش کی جاتی ہے۔ میر صاحب مرحوم نے بھی شروع شروع میں اسی شرط پر بیعت کی تھی کہ جماعت کو اُن کے عقاید سے کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنے عقاید پر قائم رہے اور جماعت میں بھی شامل ہو گئے۔

''لیکن اس قسم کی مشروط بیعت، یعنی آزادیِ عقاید کے باوجود جماعت میں شمولیت کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر ایسا کیا جائے تو کس لیے؟''

''اس لیے کہ اسلام کی خدمت میں ہم جماعت کا ہاتھ بٹائیں۔''

''وہ کیسے؟''

''یوں کہ جماعتِ احمدیہ نے تبلیغ اسلام کا جو نظام کر رکھا ہے اسے تو سب جانتے ہیں۔ پھر چونکہ تبلیغ اسلام ہی اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے، لہٰذا کیوں نہ ہم اپنے عقاید پر قائم رہیں اور جماعت میں بھی شامل ہو جائیں؛ اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

اس پر اسلام اور خدمت اسلام کا مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔ اول سوال پیدا ہوا کہ جب مقصد اسلام کی خدمت ہے اور اس لیے ہر مسلمان باوجود اختلاف عقاید جماعتِ احمدیہ میں شامل ہو سکتا ہے تو قطعِ نظر اس سے کہ جماعتِ احمدیہ کے عقاید کیا ہیں وہ اس مقصد کے پیشِ نظر خود ہی مسلمانوں میں شامل کیوں نہیں ہو جاتی؟ کیوں نہ وہ ترکِ موالات کی اس روش کو ترک کر دے جو مذہب ہو یا سیاست، یا معاشرت، غرضیکہ ہر مار میں اس نے مسلمانوں کے خلاف اختیار کر رکھی ہے؟ خدمت اسلام کی منطق کا تو بہر حال یہی تقاضا ہے کہ جماعتِ احمدیہ بھی اس نظام ملی کو قبول کر لے جو وحدت اُمت کا ضامن ہے، لیکن جو اسے قبول نہیں اور ہے تو اپنی شرط پر۔

شرط یہ ہے کہ جب اُمت کا وجود جماعتِ احمدیہ سے مختص ہے تو اُمت کو چاہیے اپنا وجود اس میں ضم کر دے؛ یہ نہیں کہ جماعتِ احمدیہ اُمت میں شامل ہو جائے۔ یہ موقف ہے جو اس نے رسالت اور ختم رسالت کے ایک ایسے تصور کی بنا پر جس سے بظاہر رسالت اور ختم رسالت کی شان میں اضافہ ہوتا ہے قائم کیا ہے لیکن جس سے نہ صرف جماعت سے باہر اُمت کا وجود کالعدم ہو جاتا ہے، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس کے سلسلۂ تعبیر و تاویل کی انتہا ہر لحاظ سے سوئے ادب پر ہوتی ہے اور یہ وہ بات ہے جو حضرت علامہ کے لیے بغایت ناگوار، بلکہ ناقابلِ برداشت تھی۔

رہی خدمت اسلام کے پیشِ نظر جماعت میں مشروط شمولیت سو اس سلسلے میں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مشروط شمولیت کو ایک طرح کی آزمایشی شمولیت ہی سے تعبیر کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ انجام کار اس کا نتیجہ ہوگا احمدیت کا تمام و کمال اقرار، یا تمام و کمال انکار، گو انکار کے مواقع کم ہیں۔ انسان جس حلقے میں شریک ہوتا اور اُٹھتا بیٹھتا ہے آخر الامر اسی میں ضم ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے صحبت کا اثر؛ اور صحبت کا اثر بڑی چیز ہے۔[2] یوں بھی اثر آفرینی اور اثر پذیری انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ لہٰذا یہ مشروط شمولیت جس کی اگر فی الواقعہ دعوت دی جاتی ہے خدمت اسلام کی دعوت نہیں ہے، بلکہ جماعت کے حلقے کو وسیع کرنے کی ایک تدبیر جس سے تبلیغی نظامات بالعموم فائدہ اُٹھاتے ہیں، حتیٰ کہ بعض تو اس معاملے میں عقاید کا نام تک نہیں لیتے، صرف میل جول اور اختلاط اور ارتباط پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان اثرات ہی کو لیجیے جو بسبب محکومی و مغلوبی مسلمانوں نے غیروں کی صحبت میں قبول کیے اور یوں رفتہ رفتہ ان راستوں پر گامزن ہو گئے جو، خیالات ہوں یا عادات، انھیں اسلام سے دور لیے جا رہے ہیں۔ اثر پذیری اور اثر افرینی کا یہی عمل ہے جس سے مذاہب پھیلتے اور قومیں ایک دوسری پر غلبہ حاصل کرتی ہیں، یا ایک تہذیب دوسری تہذیب پر چھا جاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مخالف اور موافق اثرات جو افراد کی زندگی میں اندر ہی اندر اور چپ چاپ کام کرتے رہے بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ تہذیب و تمدن کا عروج و زوال ہو یا سیاست اور معاشرت کی تبدیلیاں، تاریخ کے صفحات اس قسم کے مظاہر سے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت علامہ چائے پی چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد دوا بھی کھائی، حقے کے دو ایک کش لیے اور پھر بسبب تنفس کچھ ستا کر گفتگو کا آغاز فرمایا۔ تو اب سوال یہ تھا کہ یہ اسلام اور خدمت

اسلام کا معاملہ جس پر جماعتِ احمدیہ اس قدر زور دیتی ہے فی الحقیقت ہے کیا۔ اسلام کی
خدمت کیا صرف تبلیغ اسلام تک محدود ہے اور اسلام کا مطالبہ بھی بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسے
پورا کر دیا گیا تو گویا وہ سب ذمہ داریاں پوری ہو گئیں جو بلحاظ ایک اُمت ہم پر عائد ہوتی ہیں؟
لہٰذا دریافت طلب اَمر یہ ہے کہ تبلیغ اسلام سے مقصود کیا صرف عقاید کی تبلیغ ہے یا اس طرز
زندگی کی تبلیغ جس کی اسلام نے نوعِ انسان کو دعوت دی اور اُمت محمدیہ خیر امۃ قرار پائی۔ لیکن
جس کے لیے فرد اور جماعت دونوں کا ایک مخصوص اور مسلسل جدوجہد سے گزرنا ضروری
ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کی حیثیت انفرادی نہیں ہوگی، بلکہ سیاسی اجتماعی تاکہ ہم ایک
دوسرے سے اپنے روابط، سیرت، کردار اور معاملات کی دنیا میں وہ تبدیلی پیدا کریں جس کا
اسلام خواہش مند ہے اور جس کے پیشِ نظر اس میں ریاست کا وجود لازم ٹھہرا۔ لہٰذا اگر تبلیغ
اسلام سے مدعا ہے بلحاظ ایک دستور حیات اسلام کی تبلیغ تو اس کا بیڑا وہی جماعت اُٹھا سکتی ہے
جو خود بھی اس پر عمل پیرا ہو، ورنہ ناممکن ہے اس میں کوئی معنی پیدا ہوں۔ لیکن جماعتِ احمدیہ کا تو
یہ نقطۂ نظر ہی نہیں۔ سیاست اس کے نزدیک ایک شجر ممنوعہ ہے اور حکومت کی وفاداری خواہ کوئی
بھی ہو...... ایمان کا جزو اعظم۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں، نہ بسبب اپنے عقاید کے سوچ سکتی
ہے، کہ تاریخ کا مخفی ہاتھ ہم انسانوں کو زندگی کے کس مرحلے پر لے آیا ہے۔ وہ کیا مسائل ہیں
جو افراد و اقوام کو درپیش ہیں اور جن پر ازروے اسلام اخلاقی اور اجتماعی ہر پہلو سے توجہ کرنا
ضروری ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں کہ فکر و عمل کی وہ کیا غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں کہ بجاے
کسی محکم اور منصفانہ نظام مدنیت کے معاشرے میں ہر کہیں غصب و تغلب، رقابت اور عداوت
کا دور دورہ ہے؛ نہ افراد اس سے مستثنٰی ہیں نہ قومیں۔ برعکس اس کے فساد و ہلاکت اور عصیان و
طغیان کا ایک ریلا ہے جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جماعتِ احمدیہ
حقائق سے بے خبر اپنے مخصوص عقاید کی چار دیواری میں بند ہے۔ اسے یہ اندازہ ہی نہیں کہ
زندگی کی اس جدوجہد میں جس کا سلسلہ ابتدا سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا ہمیں اس
کے گونا گوں تقاضوں، اس کے مسلسل تغیرات اور مرتبہ بمرتبہ ارتقا میں کس نہج پر قدم اُٹھانا
چاہیے۔ نہ یہ معلوم کہ اسلام نے اس جدوجہد کا رُخ جس طرح متعین کیا اگر اس میں اسلام ہی
کی رہنمائی قبول کر لی جائے تو ہمیں اپنے فکر اور عمل کا رُخ کس طرف موڑنا ہوگا، نہ اس حقیقت

یہ ادراک کہ جب اس پہلو سے اسلام کو ایک دین اور مسلمانوں کو ایک اُمت ٹھہرایا جاتا ہے تو ان کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہوں گی۔ رہا تبلیغ عقاید کا معاملہ، یعنی بطور ایک اخلاقی مذہبی نظام کے اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت، سو یہ اَمر خالی از فائدہ نہیں۔ لیکن یوں اسلام اور عالمِ اسلام کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ مسئلہ بدستور لا ینحل ہے جیسا کہ اس وقت تھا جب احمدیت کا ظہور ہوا اور جیسا کہ اب ہے کہ اس کی تبلیغی کوششوں کا سلسلہ بقول اس کے دنیا بھر میں پھیل چکا ہے۔ دراصل اس قسم کی تحریکوں سے مسلمانوں کی طاقت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا البتہ ان جماعتوں کو ضرور تقویت پہنچتی ہے جو ان تحریکوں کو لے کر اُٹھتی ہیں۔ یوں بھی جب بسبب زوال یا مغلوبی و محکومی قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ مفلوج ہو جاتی ہے تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اور نہیں تو اُصولاً ہی دوسروں پر اپنی برتری کا سکہ بٹھائیں اور انھیں اپنا ہمنوا بنا کر شکست کو فتح سے بدل دیں۔ لیکن یہ کسی قوم کے طرز زندگی کے احیا اور نشاۃ الثانیہ کا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں ہے، نہ کبھی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سے تسکین ذات کا ایک پہلو ضرور نکل آتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ہم اپنا فریضہ ملی ادا کر چکے اور زندگی کی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے، حالانکہ زندگی کے مسائل یوں حل نہیں ہوتے۔ وہ حل ہوں گے تو مصاف حیات میں مردانہ وار قدم رکھتے ہوئے۔ مصاف حیات سے گریز حقائق سے گریز ہے، فرار اور تعطل، بلکہ ایک طرح کی خود فریبی کہ جیسے بھی حالات ہوں ہم ان پر قانع اور رضامند رہیں۔

میں نے عرض کیا، شائد اسی لیے جماعتِ احمدیہ، بالخصوص اس کی لاہوری شاخ کو آپ کی ان نظموں پر اعتراض ہے جو آپ نے اس کی تبلیغی کوششوں کے بارے میں لکھی ہیں۔ حالانکہ "ووکنگ مشن" قائم ہوا تو قطعِ نظر اختلاف عقاید کے اس کی مالی امداد میں مسلمانوں نے دل کھول کر حصہ لیا[۳] اور جس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ یاس و بے دلی کی اس فضا میں جو بسبب زوال و انحطاط عالمِ اسلام پر طاری تھی مسلمانوں کو اپنے حفظ و استحکام کی کوششوں میں ایک راہ عمل یہ بھی نظر آئی کہ اگر اہلِ یورپ نے اسلام قبول کر لیا تو ہماری شکست فتح مندی سے بدل جائے گی۔ لیکن آپ کا مقصد تو اس حقیقت کا شعور پیدا کرنا تھا کہ اگر ہم نے سمجھ لیا ہے کہ اسلام کی خالصتاً انسانی اور عالمگیر دعوت کا مطالبہ فرد اور جماعت سے کیا ہے تو پھر ہمارے لیے کوئی اور ہی جدوجہد ناگزیر ہے۔ اس کی نوعیت تبلیغی ہی نہیں ہوگی، بلکہ عملی، یعنی اجتماعی بھی۔[۴]

دراصل میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ میر صاحب نے گو شیعیت چھوڑ کر احمدیت اختیار کر لی تھی لیکن خلافت اور امامت کے مسئلے میں شیعی اور سنی عقاید سے تو خوب واقف تھے۔

ارشاد ہوا ''اس پر میر صاحب نے کیا کہا؟''

میں نے عرض کیا، اس پر باوجود ضعف و نقاہت کے میر صاحب نے جوش میں آ کر صرف اتنا کہا، ایسا نہیں ہو سکتا؛ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

''یہ ایسا نہیں ہو سکتا اور ایسا نہیں ہونے دیں گے'' کا معاملہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ احمدیت کا مطالعہ کیجیے تو اس میں کئی ایک عقاید باہم مختلط نظر آئیں گے، مثلاً خلافت اور امامت ہی کا مسئلہ ہے کہ اس باب میں احمدیت کا ذہن نہ اس وقت صاف تھا جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، نہ اب۔ اول تو سیدھے سادے عقاید کے لحاظ سے دیکھیے کہ شیعہ ہوں یا سنی دونوں کے نزدیک سلسلۂ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ اہلِ سنت کہتے ہیں باب نبوت مسدود ہے اور اس سے اہلِ تشیع کو بھی اتفاق ہے، لیکن جہاں سنی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ ذمہ داری اُمت کی ہے کہ بر بنائے کتاب و سنت، یعنی جیسا کہ شریعت کا منشا ہے، وہ اپنی رہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لے، وہاں شیعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اُمت اس رہنمائی کی اہل نہیں ہے، نہ اسے حق پہنچتا ہے کہ بشکل خلافت کسی ایسے جمہوری شورائی ادارے کی تاسیس کرے جو اس کی حیاتِ ملی کے مسلسل نشو و نما اور حفظ و استحکام کا ذریعہ بنے اور جس سے باتباع کتاب و سنت وہ سب ذمہ داریاں پوری ہوتی رہیں جو بحیثیت اُمت اس پر عائد ہوتی ہیں۔ لہٰذا بمقابلہ اہلِ سنت والجماعت شیعہ امامت منصوص کے قائل ہیں، اس لیے کہ باب نبوت بند ہوا تو سلسلۂ امامت شروع ہو گیا تاکہ آئمۂ معصومین جو منجانب اللہ اس منصب پر مامور ہیں اُمت کی رہنمائی کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام اور امامت کی اصطلاحیں شیعی مذہب کے لیے مخصوص ہیں، جیسے خلیفہ اور خلافت کی سنی دنیا کے لیے۔ گو اپنی جگہ پر ہر امام خلیفہ اور ہر خلیفہ امام ہے مگر اس لفظ کے عام اور لغوی معنوں میں۔ اس لیے کہ جس طرح امام کی ذات سے کسی ایسے اَمر کو جاری رکھنا مقصود ہے جس کی اگرچہ اس نے ابتدا نہیں کی لیکن جس کا سر رشتہ اب اس کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا وہ اس اَمر میں خلافت (جانشینی) کا فریضہ بھی ادا کر رہا ہے، بعینہٖ خلیفہ کو بھی منصب امامت حاصل ہے ان معنوں میں

ہے۔ قابلِ غور اَمر یہ ہے کہ خلافت کیا امامت کی شکل تو اختیار نہیں کر رہی؟ ثانیاً یہ سلسلہ تعبیر و تاویل اگر یونہی جاری رہا[۱۵] تو ہم کیا سمجھیں...... احمدیت کے عقاید ہمیشہ کے لیے متعین ہو چکے یا ابھی ان کی تکمیل باقی ہے؟

وقت کافی ہو گیا تھا۔ علی بخش آیا۔ کہنے لگا، دوا کھا لیجیے۔ میں نے عرض کیا، کیوں نہ اب کمرے میں تشریف لے چلیے، دھوپ کم ہو رہی ہے۔ فرمایا ''بہت بہتر''۔ علی بخش نے دوا کھلائی اور کمرے میں جا کر بستر درست کیا۔ حضرت علامہ اندر تشریف لے گئے۔ انھوں نے صحن سے کمرے کا فاصلہ نہایت آہستہ آہستہ طے کیا تھا، پھر بھی اندیشہ تھا بسبب ضعف و اضمحلال انھیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ حضرت علامہ جب تکیوں کا سہارا لے کر آرام سے بستر میں لیٹ گئے تو میں نے طبیعت کا پوچھا۔ فرمایا ''نقاہت قدرے بڑھ گئی ہے، اور کوئی شکایت نہیں۔''

شفیع آ گئے۔ سلام عرض کیا، خیریت مزاج پوچھی اور پلنگ سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ 'یوم اقبال' کی باتیں ہونے لگیں۔ کہنے لگے ان شاء اللہ یہ تقریب بڑی کامیاب رہے گی۔ تھوڑی دیر اور گفتگو کرتے رہے، پھر صحن خانہ کا رُخ کیا۔ شاید بچوں کے خیال سے۔

میں چاہتا تھا حضرت علامہ آرام فرمائیں، اجازت لوں۔ مگر حضرت علامہ قدرے ستا چکے تو فرمایا ''اس قسم کی بیعت کی جس میں انسان آزادی، عقاید کے باوجود جماعت میں شریک ہوتا اور اس کی تنظیمی اور تبلیغی کوششوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے کوئی اور شرط بھی تو ہو گی؟''

میں نے کہا، جہاں تک مجھے معلوم ہے بجز اس کے اور کوئی شرط نہیں کہ جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لے اور وہ سب چندے ادا کرتا رہے جو وقتاً فوقتاً طلب کیے جاتے یا مستقلاً طلب ہوتے رہتے ہیں۔

اس پر حضرت علامہ کچھ مسکرائے اور کہنے لگے ''تو پھر اسے سیاست کہیے، مذہب نہ کہیے۔ یہ سیاست ہوئی، مذہب تو نہ ہوا۔ سیاست کا کہنا بھی تو یہی ہے کہ حکومت کے ٹیکس باقاعدہ ادا ہوتے رہیں، ٹیکس دہندوں کے عقاید خواہ کچھ بھی ہوں۔''

حضرت علامہ تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے، لیکن میں سوچنے لگا کہ جس سیاست کا مطالبہ ہے ٹیکسوں کی باقاعدہ ادائیگی، خواہ ٹیکس دہندوں کے عقاید کچھ بھی ہوں، وہ لازماً لادین سیاست ہو گی، ریاست اور کلیسا کی تفریق، یا کسی خالصاً مادی اساس پر مبنی۔ لیکن اگر عقیدہ ہی

زمانہ باز برافروخت آتش نمرود — کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

اور جس کی فی الواقع ضرورت تھی اور ہے۔لہٰذا حضرت علامہ کا ارشاد:

حدیث عشق بہ اھل ہوس چہ میگوئی — بچشم مور مکش سرمۂ سلیمانی

پھر ضرب کلیم میں ایک دوسری حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا:

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی — فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز — سیاہ روز مسلمان رہے گا پھر بھی غلام

۵- یہ محرومی کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔اثنا عشری عقیدہ تو یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام منصب امامت سے دست بردار نہیں ہوئے لہٰذا سلسلۂ امامت برابر جاری رہا۔چنانچہ ان کے متبعین نے انھیں امام ہی مانا جیسے مرزا صاحب کو ان کے ماننے والوں نے یا جیسے خلیفہ صاحب اپنی جماعت کے امام ہیں۔پھر شیعیت کی دوسری شاخ یعنی اسماعیلی فرقے کے نزدیک جب امامت کا سلسلہ جناب اسماعیل ابن امام جعفر الصادق پر ختم ہوگیا تو آئمۂ مستورین و ائمۂ ظاہرین کا ظہور ہونے لگا۔پھر جب عبید اللہ المہدی نے خلافت فاطمیہ کی بنیاد رکھی تو مصر، افریقہ، شام و فلسطین اور عرب، بلکہ الجزیرہ اور عراق کے بعض علاقوں، تا حدود بغداد، قریباً قریباً تین صدیوں تک وہ زبردست سلطنت قائم رہی جس کے فرمانروا امام ہی تسلیم کیے جاتے تھے۔خلافت فاطمیہ اگرچہ مٹ گئی، لیکن ائمہ اسماعیلیہ کا سلسلہ اس کی مختلف شاخوں (یا فرقوں) میں اب تک جاری ہے۔ان کے پیرو بھی انھیں امام ہی تسلیم کرتے ہیں۔

۶- ان معنوں میں کہ احمدی جماعت بھی ''ضرورۃ الامام'' کی قائل ہے اور منصب امامت بھی اس کے نزدیک منجانب اللہ عطا ہوتا ہے۔گو ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں شیعی مذہب نے امامت کو منصوص ٹھہرایا ہے، لیکن امام کی موجودگی تو جماعتِ احمدیہ کے نزدیک بہر حال ضروری ہے تاکہ اُمت کی رہنمائی ہوتی رہے۔

۷- بسبب اندرونی خلفشار کے جب خود امام جماعت کی ذات پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جارہے تھے۔

۸- لاہور میں۔

۹- جیسا کہ جماعت کی غالب اکثریت کا خیال تھا۔گو یہ خیال صحیح نہیں اور نہ اس آیت کا منصب خلافت یا امامت کی طرف اشارہ ہے خواہ اس کی تعبیر شیعی نقطۂ نظر سے کیجیے، خواہ سنی عقاید کی رُو سے۔اس کا اشارہ خلیفہ کے اصطلاحی مفہوم بمعنی امام و رہنما، یا پیشوا اور جانشین، یا سربراہ ریاست کی طرف بھی نہیں ہے۔اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ کسی فرد کو منجانب اللہ یا خود اپنی ذات سے، یا ذاتی دعوے کی بنا پر اُمت کی پیشوائی کا حق پہنچتا ہے۔

۱۰- سنی عقیدے کے خلاف کہ امام یا خلیفہ کا انتخاب (لہٰذا عزل و نصب) اُمت کے ہاتھ میں ہے کہ

بر بنائے شوریٰ جسے چاہے کثرت رائے سے منتخب کر لے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سوادِ اعظم کا عمل کتاب و سنت پر ہے تو خلیفہ یا امام کا انتخاب بھی منشائے شریعت کے مطابق ہوگا، ورنہ نہیں۔ یہی 'ورنہ نہیں' ہے جس کے پیشِ نظر شیعیت کو اس اَمر سے انکار ہے کہ امامت اور خلافت کا فیصلہ اُمت کے ہاتھ میں ہے۔

۱۱- یہ اس وقت کی بات ہے جب سلسلے کے اندر ایک شدید اختلاف رونما تھا، لیکن جس سے سلسلے کی اکثریت بے تعلق رہی اور اس لیے اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا۔ اختلاف کے ایک پہلو کا تعلق تو نفس خلافت سے تھا کہ یہ عہدہ موروثی ہے یا انتخابی، دوسرے کا خود خلیفہ صاحب کی ذات سے۔ معترضین کا جہاں یہ خیال تھا کہ منصب خلافت کو موروثی شکل دی جارہی ہے وہاں یہ بھی کہ خلیفہ صاحب کا طرزِ عمل مصالح جماعت، یعنی ان مقاصد کے خلاف ہے جو احمدیت کے سامنے ہیں، لہٰذا اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو اس نے منصب خلافت کے لیے قائم کیا ہے۔ دوسری جانب معترضین کا اگر بدلائل رد کیا گیا تو ان کے لیے بڑے سخت کلمات بھی استعمال ہوئے۔

۱۲- اگر امامت منجانب اللہ ہے اور نصاً ثابت، لہٰذا ائمہ باوجود بشریت معصوم، تو ظاہر ہے ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوسکتا جو قابلِ اعتراض ہو اور نہ بسبب اس منصب کے جو انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ان سے کسی اَمر کی باز پرس کی جاسکتی ہے۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اگر امامت کے بارے میں شیعی نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ماننا خود بخود لازم ٹھہرتا ہے۔ گویا اسماعیلیوں کے یہاں صرف اس اَمر کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

۱۳- حالانکہ خلافت کو محض مذہبی پیشوائی پر محمول کرنا غلط ہے؛ کیا جائے گا تو اس صورت میں جب کوئی مذہبی جماعت اسلام کو صرف اپنے جماعتی نظام تک محدود کر لے۔ خلافت تو ایک سیاسی اجتماعی ادارہ ہے، لہٰذا اسلام کی اس ہمہ گیر تحریک کو جاری رکھنے کا دوسرا نام جس سے مقصود ہے نوعِ انسانی کو ہر پہلو سے ایک خاص نصب العین پر جمع کرنا تاکہ وہ اپنے اتحاد و ارتباط اور مسلسل نشو و نما میں برابر آگے بڑھتی رہے۔ اس کی غایت ہے اس خالصاً انسانی نظام مدنیت کا قیام و استحکام جس کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ٹھہرا اور جس کے بغیر ناممکن ہے ہم ان قوتوں پر غلبہ حاصل کر سکیں جو تاریخ کی صورت گر ہیں، یعنی ان کا رُخ ان مقاصد کے طرف موڑ دیں جن کے لیے اُمت کی تشکیل ہوئی۔ کیا خوب کہا ہے حضرت علامہ نے:

خلافت بر مقام ما گواہی است — خلافت حفظ ناموسی الٰہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — حرام است آنکہ برما بادشاہی است

ارمغان حجاز

۱۴- جیسا کہ سنی اور شیعی نقطۂ نظر سے ان اصطلاحات کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ پندرہ بیس منٹ استراحت فرمائی۔ پھر ارشاد ہوا ''چلم بدلو اور بستر درست کردو۔'' مطلب یہ تھا کہ اب کمرے میں چلیں گے۔ علی بخش نے تعمیل ارشاد کی۔ حضرت علامہ کمرے میں تشریف لے گئے اور قدرے ستا کر حقے کا کش لیا تو فرمایا ''حقے کا مزہ جاتا رہا'' اور یہ تھا بھی ٹھیک اس لیے کہ دم کشی کے باعث مسلسل کیا ذرا سے کش لگانا بھی ناممکن تھا۔ میں پاس ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ارشاد ہوا ''علی بخش چائے تیار کرو''۔ پھر میری طرف اشارہ کیا اور فرمایا ''یہ کب سے بیٹھے ہیں، چائے پییں گے۔''

روزمرہ سیاست کی باتیں ہونے لگیں اور روزمرہ سیاست سے گفتگو کا رُخ سیاسی جماعتوں اور سیاسی جماعتوں سے ان افراد کی طرف مڑ گیا جو یکے بعد دیگرے میدان سیاست میں اُبھرے۔ ارشاد ہوا ''ایک دور دورِ وفاداری تھا۔ اس دور میں بھی قوم کا وجود ان افراد سے خالی نہیں تھا جو دل سے حکومت کے وفادار تھے۔ بایں ہمہ ان کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا اور وہ سچے دل سے ملت کے بہی خواہ تھے۔'' یوں باتوں باتوں میں...... کا ذکر آ گیا۔ فرمایا ''عام خیال یہ ہے کہ وفاداری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ بات ایک حد تک ٹھیک ہے مگر وہ کرتے بھی تو کیا؟ وہ حکومت کے ممنون احسان تھے۔ انھیں جو کچھ ملا سرکار انگریزی سے ملا۔ لہٰذا انگریزوں سے ان کے حسن ظن اور انگریزی حکومت سے وفاداری کی ایک وجہ ان کا جذبۂ تشکر بھی تھا۔ یہ نہیں کہ وہ غلامی اور محکومی پر رضامند تھے جیسا کہ اربابِ سیاست عام طور پر سمجھتے ہیں۔'' ارشاد ہوا ''جس طرح آج آزادی اور استقلال کی صدائیں عام ہو رہی ہیں ایسے ہی ایک زمانہ تھا کہ بجز وفاداری کے کوئی دوسرا لفظ سننے میں نہیں آتا تھا۔[۶] لیکن ان حضرات کا دل اس دورِ وفاداری میں بھی خلوص اور دردمندی سے خالی نہیں تھا۔ انھیں قوم سے سچی محبت تھی۔ پھر حقوق طلبی کا دور آیا اور اس دور میں بھی انھوں نے دیانت داری سے قوم کا ساتھ دیا۔ مگر زمانہ بڑا تیز رَو ہے۔ اسے نرم روی پسند نہیں...... بالطبع نرم رو، یا باصطلاحِ سیاست اعتدال پسند تھے اور اپنے اعتدال پسند احباب کی طرح ان تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکے جو زمانہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔'' فرمایا ''افسوس ہے مسلمان سیاسی اعتبار سے ہمیشہ غیر منظّم رہے۔ ان میں کوئی اعتدال پسند فریق قائم نہ ہو سکا جس میں ان حضرات کا فی الواقعہ شمار ہوتا۔ ہندو البتہ کہیں زیادہ منظّم ہیں۔ ان کے یہاں بھی ایک اعتدال پسند فریق[۷] موجود ہے لیکن کوئی نہیں جو اسے

کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ انگریز اس ملک پر قابض رہیں۔ لہٰذا ان کے سامنے دو ہی راستے تھے..... انگریزوں کی مخالفت، یا موافقت۔ مختصراً یہ کہ ان کی سیاست میں نرم و گرم یا یمین و یسار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ وفادار تھے یا باغی، اعتدال پسند بہر حال نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو ان کا شمار وفاداروں ہی میں ہوتا۔[۸]

حضرت علامہ نے میری معروضات سنیں تو فرمایا "سر سیّد کی ذات بڑی بلند تھی، بڑی ہمہ گیر۔ افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا"۔ ارشاد ہوا "انگریز بڑا کایاں ہے۔ سیاست کے داؤ پیچ خوب سمجھتا ہے۔ اس نے وہاں بھی جود وسخا سے کام لیا جہاں وفاداری میں ابھی محکومی پر قناعت اور رضامندی کا رنگ پیدا نہیں ہوا تھا۔" پھر قدرے سکوت فرمایا جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور کہا "مثلاً .... نے خود مجھ سے کہا......"

میرے دل میں ایک بات کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ جس طرح وفاداری سے رفتہ رفتہ محکومی پر قناعت اور رضامندی کو تحریک ہوئی بلکہ ایک حد تک اس خیال کو کہ برطانوی نظام حکومت سے بہتر نہ کوئی نظام سیاست ہے، نہ برطانوی سلطنت کو شاید کبھی زوال ہوگا، بعینہٖ تعلیم سے تقلید و تشبہ کو۔ علی گڑھ کی عمارت آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونوں پر تیار ہوئی تھی۔ اس سے مسلمانوں کا ذہنی احیا مقصود تھا، نہ ان کے شعورِ ملی کی تقویت۔ مقصد تھا تو یہ کہ مسلمان مغربی علوم و فنون حاصل کریں اور مغربی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوں۔ یہ مقصد پورا ہوا، مسلمان مغرب کی طرف بڑھے اور جیسا کہ سر سیّد نے کہا تھا اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ اسلام ان کی ترقی میں حائل ہے، نہ سیاست اور تہذیب و تمدن میں آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ وہ حکومت وقت سے اشتراک اور مغربی تہذیب اختیار کریں جب بھی مسلمان رہ سکتے ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک منفیانہ طرزِ عمل تھا، اس لیے کہ محض اتنا کہ دینے سے کہ اسلام ہماری ترقی میں حائل نہیں کوئی مثبت راہ عمل پیدا نہیں ہوتی، نہ سیاست میں، نہ تہذیب و تمدن میں، گو باعتبارِ وقت یہ خیال بھی غنیمت تھا۔ یوں ایک نیا عزم اور نئی بیداری پیدا ہوئی لہٰذا علی گڑھ صحیح اسلامی تعلیم کا نہ سہی، ایک نئی قومی زندگی اور نئی روح کا مظہر بن گیا۔ وہ روح جو ہمارے جذبۂ ملی اور قومی عصبیت کا سرچشمہ ہے اور جس کی بدولت ہم نے ماضی سے نکل کر مستقبل میں قدم رکھا۔ لیکن علی گڑھ نہیں سمجھا کہ اسلام نے تہذیب و تمدن کا ایک اپنا تصور قائم کیا ہے اور ہماری

ہے تو اس کے اماراتی نظام[۱۰] کا۔

فرمایا ''تمھارا خیال صحیح ہے۔ یہ مسئلہ کہ جماعت کے باب میں اس کا مسلک کیا تھا فی الواقعہ مختلف فیہ ہے۔ ممکن ہے اس کا خیال ہو کہ فوق البشر ہی رفتہ رفتہ یک جماعت کی شکل اختیار کر لیں گے۔[۱۱]

میں نے عرض کیا، لیکن فوق البشر کا ظہور تو کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اس کی ساری خوبی اس کی انفرادیت اور کمیابی میں ہے۔ وہ نصب العین ہے، باقی سب اس کے پیرو اور منتظر۔

فرمایا ''جب ہی تو اس کے متبعین نے اس باب میں الگ الگ رائیں قائم کی ہیں، لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ نیٹشے کی طبیعت پر انفرادیت پسندی ہی کا غلبہ تھا۔ اس کی ہمشیرہ[۱۲] نے بھی تو یہی لکھا ہے کہ اسے ایرانیوں[۱۳] کا یہ عقیدہ کہ ہر صدی میں ایک مجدد[۱۴] کا ظہور ہوتا ہے[۱۵] بڑا پسند تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو مجدد ہی سمجھتا ہو۔''[۱۶]

حواشی

۱- قرشی صاحب۔

۲- بسلسلہ ارمغان حجاز

۳- یہ الماری حضرت علامہ کے سرہانے دیوار سے لگی تھی (شاید اب بھی) جس میں قرآن مجید کے علاوہ کچھ کتابیں اور کاغذات رکھے رہتے۔

۴- خاصا پرانا اور سال ہا سال سے حضرت علامہ کے زیر استعمال۔

۵- Will, to power باتباع کانٹ اور شوپن ہاوئر۔ کانٹ کے نزدیک عقل محض نارسا ہے، حقیقت تک نہیں پہنچتی۔ لہٰذا انسان کا سہارا ہے ارادہ برائے خیر عملاً اور اخلاقاً دونوں لحاظ سے۔

شوپین ہاوئر کہتا ہے ارادہ (مشیت) ہی اصل حقیقت ہے، گو بے بصر۔ لہٰذا اس کی قنوطیت کہ جو کچھ ہے عبث، بے معنی اور بے مقصد۔ زندگی محض دکھ ہے۔ نیٹشے کہتا ہے بہتر، لیکن اس قنوطیت اور دکھ درد کو طاقت کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ دیکھیے پیام مشرق ''شوپن ہار و نیٹشا''۔

مرغے ز آشیانہ بہ سیر چمن پرید — خارے زشاخ گل بہ تن نازکش خلید
بد گفت فطرت چمن روزگار را — از درد خویش وہم زغم دیگراں تپید

جس پر نیٹشے نے کہا:

درمیان ز درد ساز اگر خستہ تن شوی — خوگر بہ خار شوکہ سراپا چمن شوی

۶- اور اس لیے اخلاق بھی طاقت کے تابع ہے، لیکن حضرت علامہ کے نزدیک طاقت کا معیار ہے اخلاق اور اخلاق سے مقصود حفظ خودی-خودداری، خودگری، خودنگری۔

۷- ارادہ برائے طاقت کا مظہر اتم بمقابلہ نائب حق، جو طاقت کے باوجود مکارم اخلاق کا نمونہ ہے اور نوع انسانی کے لیے رحمت۔ نائب حق کی ذات میں طاقت کی حیثیت بھی ایک اخلاقی قدر کی ہو جاتی ہے۔

۸- جیسے غالباً نیٹشے کا۔

۹- جیسا کہ بزبان عارف روم حضرت علامہ نے رموز بے خودی کے تعارف میں فرمایا:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب — زود تر واللہ اعلم بالصواب

۱۰- یونان کی سیاسی اصطلاح میں (Aristocratic) بمقابلہ جمہوری (Democratic) تا کہ زمام اقتدار خواص کے ہاتھ میں رہے۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ یورپ کے سیاسی نظام میں عوام کو خواص پر برتری حاصل ہے۔ درآں حالیکہ برتری خواص کا حق ہے، نہ کہ عوام کا۔

۱۱- اور جس میں اقلیت (خواص) اکثریت (عوام) پر غالب رہے گی۔

۱۲- Elizbeth ایلزابیتھ اپنے بھائی کی سوانح نگار اور آخر عمر بالخصوص زمانہ علالت میں اس کا سہارا۔

۱۳- قبل اسلام کے ایرانیوں، یعنی مجوسیوں، عرف عام میں پارسیوں یا پیروان زرتشت کا۔

۱۴- لغوی، نہ کہ اسلامی اصطلاح میں۔

۱۵- اصطلاحاً زرتشت کے کسی نازائیدہ بیٹے، یعنی مثیل کا۔ جیسا کہ معلوم ہے مجوسیوں کے نزدیک خیر اور شر دو الگ الگ اُصول ہیں۔ محاورۂ عام میں خیر کو یزداں کہا گیا ہے، شر کو اہرمن۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا دونوں میں مسلسل آویزش جاری ہے۔ ابتدا میں خیر کو غلبہ حاصل تھا۔ پھر شر نے خیر پر فتح پائی۔ آخرالامر خیر ہی کا غلبہ ہوگا، لیکن اس زمانے میں کہ خیر شر سے مغلوب ہے اور جسے بیچ کا زمانہ کہا گیا ہے ایسی عظیم ہستیوں کا ظہور ہوتا رہے گا، جن سے خیر کو تقویت پہنچے گی۔ اہلِ مغرب نے ان کو زرتشت کے نازائیدہ بیٹے کہا ہے، حضرت علامہ نے مجدد۔ اس لیے کہ یہی ہستیاں ہیں جن کی بدولت دین زرتشت کی تجدید ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مجوسی ذہن پر انتظار کا غلبہ ہے۔ ہمیشہ کسی آنے والے کا منتظر۔

۱۶- نیٹشے زرتشت کا بڑا قائل تھا۔ وہ اس کا ذکر بڑے ذوق وشوق سے کرتا ہے، بلکہ اپنے آپ کو اس کا پیرو ٹھہراتا ہے، عقیدۃً نہیں معناً اس لیے کہ نیٹشے کو بھی اپنے رنگ میں ایک معرکہ درپیش تھا۔ خیر وشر کا نہ سہی، انسان کی تقدیر اور مستقبل کا۔ وہ کہتا ہے زندگی نام ہے اس مسلسل آویزش کا جس میں ہماری

علامہ پر رقت طاری ہوگئی اور وہ بار بار اس کا تکرار کرنے لگے۔ میں خاموش ہوگیا۔ اس پر انھوں نے تیسرا مصرع خود ہی ارشاد فرمایا، لیکن ابھی پورے طور پر ادا نہیں کر پائے تھے کہ آواز گلوگیر ہوگئی اور وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ احبابِ دہلی پریشان ہوگئے۔ رباعی یہ تھی:

تم واماند و جانم در تگ و پوست　　سوے شہرے کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز　　کہ من دارم ہوائے منزل دوست

میں خاموش تھا، احبابِ دہلی خاموش۔ وہ بڑی تشویش اور پریشانی سے حضرت علامہ کے جذب وگداز کی اس کیفیت کو دیکھ رہے اور اندر ہی اندر مضطرب تھے کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پر نہ پڑے۔ دو چار لمحے اسی حالت میں گزر گئے تا آنکہ حضرت علامہ کو سکون ہوا اور مولانا نے فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو پوری کرے۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کوئی اور رباعی یاد ہو تو عرض کروں۔ میں نے قدرے تامل کیا اور پھر موقعے کی رعایت سے وہ رباعیاں سنائیں جن میں خطاب سلطان ابن سعود سے ہے:

تو سلطان حجازی من فقیرم　　ولے در کشور معنی امیرم

جہانے کو ز تخم لا الہ رست　　بیابا بنگر باغوش ضمیرم

اور

تو ہم آن مے بگیر از ساغر دوست　　کہ باشی تا ابد اندر بردوست

سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں　　بروبم از مژہ خاک در دوست

میرا خیال تھا ممکن ہے، یوں حضرت علامہ کا ذہن آسودہ ہو؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے بہ سکون اپنے اشعار سنے۔ کبھی کبھی حقے کا کش بھی لے لیتے۔ سلسلہ خیالات نہ معلوم کہاں تھا۔ مولانا شاید کوئی سوال کرنا چاہتے تھے کہ سلطان ابن سعود کا ذکر جو آیا تو بفحوائے

باز گو از نجد و از یاران نجد

احبابِ دہلی نے سلطان اور اس کی حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ شاید اس خیال سے کہ حضرت علامہ بھی اس سلسلے میں کچھ ارشاد فرمائیں اور سرزمین عرب میں جو سیاسی اخلاقی انقلاب آچکا ہے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یوں بھی حجاز اور سلطان حجاز کا ذکر آئے اور حرمین الشریفین پر گفتگو ہو تو ناممکن ہے، خاک پاک عرب کے سیاسی اور اجتماعی شئون

بھی آپ ہی آپ ان کے سامنے آجائیں گے جن پر آپ گفتگو کر رہے ہیں۔[9]

اس پر عرض کیا گیا کہ اگر عربوں کا عمل اسلام پر ہے تو یہ فطرت آپ ہی بدل جائے گی۔ دین ہی تو فطرت انسانی کا محافظ اور صورت گر ہے۔[10] مگر یہ ایک طرف دین سے تمسک اور دوسری جانب استبداد اور ملوکیت، یہ دولت کی اجارہ داری اور غلامی یہ معاملہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں ناممکن ہے عربوں میں وہ تغیر پیدا ہو جو کتاب وسنت کا مقصود ہے۔ کیا یہ اَمر ابھی اجتہاد طلب ہے کہ اسلام کی روح غصب و تغلب کے خلاف ہے۔ اس میں کسی ایسے طرزِ معاشرت کی گنجایش نہیں جس سے انسان کے شرف اور احترام ذات کو ٹھوکر لگے۔ سلطان اس تحریک کے علم بردار ہیں جسے احیائے شریعت اور تجدید دین کا دعویٰ ہے۔ ان کے لیے یہ سمجھنا کیا مشکل ہے کہ اسلام ان سے کس طرزِ عمل کا طالب ہے۔ اللہ نے انھیں حکومت دی ہے، طاقت دی ہے، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

حضرت علامہ آرام سے لیٹے حقے کے کش لگا رہے تھے کہ مولانا نے کہا، عرب کیا سارے عالمِ اسلام کی حالت افسوسناک ہے۔ دین کا فہم کہاں ہے؟ کہیں بھی نہیں، ہمارے اور اسلامی دنیا میں باہم ربط وضبط کا کوئی ذریعہ باقی رہ گیا ہے تو حج۔ لیکن حج کی حیثیت بھی کیا ہے ایک بے روح رسم و رواج، یا زیادہ سے زیادہ ایک روحانی فریضہ، بلکہ سچ پوچھیے تو بعض صورتوں میں محض تجارت۔[11] حالانکہ اگر حج سے معاشی سود و بہبود کا راستہ کھلے تو شریعت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ قرآن مجید نے تو پہلے ہی اس اَمر کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ لوگ ان فوائد کو سمجھیں جو اس اجتماع میں پوشیدہ ہیں۔[12] کہنے لگے اور تو اور ہمارے علما بھی شاید اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ حج سے مقصود ہے اُمت کا اتحاد و استحکام اور اُمت تمہید ہے وحدت انسانی کی یا یوں کہیے کہ اخلاقی اجتماعی ہر پہلو سے ایک عالمگیر معاشرے، بہ الفاظ دیگر انسانیت کبریٰ کی اساس۔ مولانا کے اس ارشاد پر میرا ذہن بے اختیار حضرت علامہ کی اس رباعی کی طرف منتقل ہو گیا جو ارمغان حجاز میں موجود ہے، لیکن جسے حضرت علامہ کی اس کیفیت کے خیال سے جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ان پر طاری ہو چکی تھی مجھے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔[13] میں خاموش ہو گیا۔

مولانا برابر حج پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں مولانا فاخر[14] کا ذکر آ گیا۔ مولانا کہنے لگے وہ سفر حج سے واپس آئے تو جو کوئی ملتا اس سے بڑے فخر سے کہتے، شاید اپنے

نام کی رعایت سے کہ رمی الجمار میں میں نے شیطان کو وہ وہ کنکریاں رسیدکیں کہ یاد ہی کرے گا۔ اس پر حضرت علامہ بھی بہت محفوظ ہوئے، بلکہ انھیں کچھ ہنسی بھی آ گئی جیسے حضرت فاخر کی شیطان کو پرانی چشمک ہو۔ مولانا نے اپنے سفرحج کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا اور وہ یہ کہ ان کے رفقا سفر میں سے ایک اونٹنی پر سوار بڑے اطمینان سے قطع مسافت کر رہے تھے کہ دفعۃً انھیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ مگر ادھر انھوں نے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر ایک کش لیا اور ادھر تڑاق سے ایک درہ ان کے منہ پر پڑا۔ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے سعودی عرب میں سگریٹ پینا منع ہے۔ آیندہ جب کبھی سگریٹ دیکھتے تو ان کی حالت غیر ہو جاتی۔ اس پر پرویز صاحب نے کہا یہ ہے وہابیت کی نفسیات! کسی نے کہا اس کی تاریخ بھی۔

وہابیت کی نفسیات یا دوسرے لفظوں میں وہ مذہبی رویہ جس کی نظر صرف ظاہر پر ہے اور اس حقیقت سے بے خبر کہ اعمال وعقاید کا سرچشمہ خارج میں نہیں ہے، داخل میں، یعنی ہمارے ضمیر اور باطن میں کہ ان کی پابندی پر اگر محض قانوناً اصرار کیا گیا تو وہ مقصد پورا نہیں ہوگا، جس کے لیے اعمال وعقاید کی ضرورت پیش آئی، نہ یہ ممکن کہ وہ ضبط ونظم متشکل ہو جسے انسان خود اپنے فہم وبصیرت کی روشنی میں بطیّب خاطر اس لیے اختیار کرتا ہے کہ یہ اس کے اپنے فائدے کی بات ہے۔ اعمال وعقاید کا تقاضا ہے ضبط ونظم اور ضبط ونظم لازمۂ حیات، لیکن یہ تقاضا جب ہی پورا ہوگا کہ ہمیں حقائق کا شعور ہو۔ حقائق کا شعور ہے تو خودآگاہی بھی ہے اور خودآگاہی ہے تو تقویٰ بھی کہ ہمیں اپنے نفع وضرر کا احساس رہے۔ خودآگاہی نہیں تو اعمال وعقاید کی کوئی روح ہے، نہ ان کی پابندی کے کچھ معنی، یہی وجہ ہے کہ اس نظم وضبط سے جو بہ زور قانون خارج سے عائد کیا جاتا ہے تربیت ذات ہی کا امکان ہے نہ تعمیر شخصیت کا، نہ یہ ہوگا کہ فرد اور جماعت کے اقدامات زندگی کی مسلسل اور پیش رس حرکت کا ساتھ دیں اور ہم اس کا رُخ ان مقاصد کی طرف موڑ سکیں جو ہمارے سامنے ہیں اور جو ہم نے خود اپنے لیے تجویز کیے۔ برعکس اس کے یوں تعصب اور تنگ نظری، جمود اور قدامت پسندی ہی کو تحریک ہوگی۔

لہٰذا تعصب اور تنگ نظری، جمود اور قدامت پسندی کی یہی روش تھی جس سے وہابیت کی تاریخ میں ایک ایسی خشونت اور جارحیت پیدا ہوگئی کہ اس نے سب سے پہلے عالم اسلام ہی کو اپنا ہدف بنایا[۱۵] حالانکہ یہ اَمر اس مصلح عظیم[۱۶] کی تحریک اصلاح کے خلاف تھا جس سے ساری

کی حکومت ان سب کوتاہیوں کے باوجود عربوں کے حق میں ایک فال نیک ہے۔ انھیں مدت کے بعد ایک عمدہ قیادت ملی ہے۔ ان کی حالت ہر اعتبار سے روبہ اصلاح ہے۔ ذرا حالات کو بدلنے دیجیے، سعودی حکومت کی تنگ نظری آپ ہی آپ ختم ہوجائے گی،[۲۳] لیکن ابھی ایک اور بات تھی جو مولانا کو سلطان کی حمایت پر مجبور کرتی۔ وہ جو حضرت علامہ نے اپنے رنگ میں کہا ہے:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے | بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

گو از رہ خیر خواہی، نہ کہ از رہ مذمت، مولانا کا نقطۂ نظر اس کے برعکس یہ تھا کہ عالمِ اسلام میں جہاں کہیں اور جو بھی سیاسی، اخلاقی انتشار رونما ہوا عجم کے ہاتھوں۔ انھیں گویا عجم سے کد تھی۔ لہٰذا عربوں کی تنقید میں مخالف ہو، یا موافق ان کے دل میں ہمیشہ عرب کی محبت موجزن رہتی۔ وہ کہتے عالمِ اسلام کی اصلاح اور عجمی فتنوں کے ازالے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ عرب از سرِ نو زندہ ہوں۔ عرب سنبھل گئے تو اسلام کی حقیقی روح بھی جو طرح طرح کے اثرات سے دب رہی ہے پھر سے بیدار ہوجائے گی اور مسلمان خود ہی اس راستے پر لوٹ آئیں گے جس سے مدت ہوئی وہ بھٹک گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج شریعت کی ظاہری اور سطحی پابندی بے نتیجہ نظر آ رہی ہے۔ اس کی حیثیت بھی محض ایک قشر کی ہے، مغز سے خالی، لیکن یہ قشر بھی کوئی معمولی قشر نہیں۔ وقت آنے دیجیے، اس کے اندر بھی حقیقی معنی پیدا ہوجائیں گے۔ یوں یہ سلسلۂ گفتگو لفظاً نہ سہی، معناً حضرت علامہ ہی کے ان اشعار پر ختم ہوگیا جن میں انھوں نے اُمرائے عرب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے:

اے فواد، اے فیصل، اے ابن سعود | تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود

در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت | زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت

خاک بطحا خالدے دیگر بزاے | نغمۂ توحید را دیگر سراے

اے نخیل دشت تو بالندہ تر | برخیزد از تو فاروقے دگر

حضرت علامہ نے فرمایا ''عرب اور عجم دونوں ہمارے ماضی کا تار و پود ہیں۔ ہم عرب کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ عجم کو۔ ہمیں چاہیے ماضی کی تنقید میں مستقبل کو فراموش نہ کریں۔'' ارشاد ہوا ''یوں دیکھنے میں مسلمانوں کی حالت بڑی پست ہے۔ انھیں نہ حال کا شعور ہے نہ ماضی کی خبر، نہ یہ کہ مستقبل کو ہم سے کس قسم کے عمل کی طلب ہے۔'' حضرت علامہ رُک گئے پھر جب

تنفس کی تکلیف کم ہوئی تو فرمایا۔ ''عالمِ اسلام کے حالات بدل رہے ہیں۔ یوں بھی مسلمانوں میں اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ اسلام سے بھی ان کا رشتہ بہرحال قائم ہے۔ ان کی اصل ضرورت ہے قیادت۔ صحیح قیادت میسر آ جائے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔''

اس پر گفتگو کا رنگ بدلا۔ امم اسلامیہ کا ذکر ہونے لگا۔ ان کی گوناگوں صفات، اخلاق و عادات کا۔ ترکوں نے اپنے آپ کو کس خوبی سے سنبھالا ہے۔ اخوان کی تحریک[۲۴] کس قدر اُمید افزا ہے۔ عربوں کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کے لیے اس کے نتائج کیسے دوررس اور خوش گوار ہوں گے۔ اس پر عرض کیا گیا کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں، لیکن اسے کیا کیجیے کہ عالمِ اسلام میں کہیں اس زندگی کے آثار نظر نہیں آتے جس میں کتاب و سنت کی روح کارفرما ہو۔ ترک اور عرب اور ایسے ہی دوسری مسلمان قومیں تو خیر اپنی نسلی اور قومی عصبیت کے سہارے شاید سنبھل جائیں اور ایک گونہ ترقی بھی کر لیں، مگر سوال ہمارا ہے، ہندی مسلمانوں کا کہ باوجود بڑے بڑے دعووں اور بڑی بڑی تحریکوں کے ہمارا کوئی نصب العین ہے، نہ لائحہ عمل۔ ہمارے انتشار اور پراگندہ خیالی کا خاتمہ ہوگا تو کیسے؟

حضرت علامہ نے قدرے توقف فرمایا۔ پھر ارشاد ہوا ''مجھے تو مسلمانوں کے مستقبل سے قطعاً مایوسی نہیں۔ ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو قیادت۔ ہمارے دعوے اور ہمارے اقدامات ہی جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس اَمر کا ثبوت ہیں کہ ہم میں ہر طرح کی استعداد موجود ہے۔ نہیں موجود تو قیادت۔''

عرض کیا گیا، لیکن بہ ظاہر تو کوئی امکان نہیں کہ ہمیں صحیح قیادت میسر آئے اور ہماری صفوں میں جو انتشار رونما ہے اتحاد اور جمعیت سے بدل جائے۔

حضرت علامہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر بڑے پر یقین لہجے میں کہنے لگے ''مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی صاحب ایمان اُٹھ کھڑا ہوگا اور اس کا خلوص اور دیانت ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گا۔'' ارشاد ہوا ''یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے، حقیقت ہے۔''[۲۵]

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ حضرت علامہ رُک رُک کر گفتگو فرما رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی۔ ان کے یہ الفاظ کہ یہ محض خیال ہی نہیں ہے، حقیقت ہے بھی ہمارے ذہن میں گھوم رہے تھے کہ انھوں نے فرمایا ''ہمارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ اتحاد۔ مسلمان

متحد ہو گئے تو ان کی جداگانہ قومیت تسلیم کر لی جائے گی۔ جداگانہ قومیت تسلیم کر لی گئی تو ہم آزادی سے اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں گے۔

کیا اسلامی ریاست قائم ہو گی؟

''کیوں نہیں، بشرطیکہ ہم اپنا اتحاد قائم رکھیں اور اس دعوے سے دست بردار نہ ہوں کہ ہندوستان میں ایک نہیں کئی قومیں بستی ہیں۔ ہندوستان بھی محض ایک جغرافی اصطلاح ہے اور اس کا اتحاد بیرونی حملوں سے خطرے کا نتیجہ۔ اسلام بھی مذہب نہیں کہ اس کی تعبیر مذہب کے عام معنوں میں کی جائے۔ اس طرح اس کا تعلق صرف فرد کی ذات سے ہے۔ اسلام ایک نظام مدنیت بھی ہے جس کی نفی اسلام کی نفی ہے۔ ہم اس نظام مدنیت سے انحراف نہیں کر سکتے۔ یہی نظام مدنیت ہماری جداگانہ قومیت کا راز ہے۔ انگریز تو اس نکتے کو سمجھتا ہے، ہندو اسے سمجھنا نہیں چاہتے''[۲۶]

احبابِ دہلی خاموش حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یہ اَمر کہ اسلام بجائے خود ایک نظام مدنیت ہے تو شاید مشکل سے سمجھ میں آئے۔ مسلمانوں کو خود بھی اس کا پورا پورا شعور نہیں، لیکن اگر ہماری جداگانہ قومیت کا راز یہی نظام مدنیت ہے اور اسلامی ریاست سے مقصود بھی اسی کا نفاذ تو کیوں نہ کانگریس کے اس اعلان سے فائدہ اُٹھایا جائے کہ حصول آزادی پر ہندوستان میں جو وفاق قائم ہو گا اس میں صوبے اس اَمر کے مجاز ہوں گے کہ اگر چاہیں تو مرکز سے الگ ہو جائیں۔ لہٰذا ہم کانگریس کی تحریک آزادی میں اس کا ساتھ دیں اور اگر کانگریس ہماری اکثریت کے صوبوں میں ہمیں اپنی مرضی کے مطابق حکومت نہ کرنے دے تو مرکز سے الگ ہو جائیں۔ یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اسلامی ریاست کے قیام کی۔

اس پر حضرت علامہ نے کچھ تبسم فرمایا اور کہنے لگے ''لیکن تم بھولتے ہو اول تو کانگریس کا یہ اعلان بجائے خود وضاحت طلب ہے۔ کانگریس کا موقف تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک جغرافی وحدت ہے۔ لہٰذا اس میں بسنے والے ایک قوم۔ مذہب افراد کا ذاتی معاملہ ہے، سیاست سے بے تعلق کانگریس کیسے گوارا کرے گی کہ حصول آزادی کے بعد وہ اس وحدت سے دست کش ہو جائے جس پر آج اسے اصرار ہے اور جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کے جداگانہ ملی وجود سے انکار کر رہی ہے۔ پھر صوبوں سے کانگریس کا مطلب صوبے ہیں، نہ کہ باعتبار مذہب ان کی الگ الگ آبادی کہ مذہب کی بنا پر اس کا ایک حصہ دوسرے سے الگ ہو جائے یا کسی ایسے

نظام مدنیت کے نفاذ کا مطالبہ کرے جس سے دوسرے کو اختلاف ہو۔'' ارشاد ہوا ''صوبے مرکز سے ملحق رہیں یا بے تعلق ہو جائیں ان کا مدار سیاست بہر حال وہی لادین سیاست ہوگی جو محض جغرافی قومیت کی قائل اور اسے بنائے اجتماع سمجھتی ہے۔ لہٰذا نہ غیر مسلم کسی ایسے مطالبے میں جس کی بنا اسلام پر ہے مسلمانوں کا ساتھ دیں گے، نہ ان کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان سے الگ کر سکیں۔ اگر کانگریس فی الواقعہ سمجھتی ہے کہ حصول آزادی پر مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اگر چاہیں تو اپنے مخصوص نظام مدنیت کے پیشِ نظر مرکز سے الگ ہو جائیں تو اسے آج کل ہماری جداگانہ قومیت سے کیوں انکار ہے؟ کیوں نہ آج ہی یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اس لیے سیاسی سمجھ بوجھ کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔''

حضرت علامہ گفتگو کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ انھوں نے تھوڑی دیر ستا کر پھر فرمایا ''صوبوں میں اس قسم کی جماعت بندی ضرور ہو سکتی ہے جیسی آج یونینسٹ پارٹی نے قائم کر رکھی ہے، لیکن اس کی ترکیب بھی وہی ہوگی جو اس پارٹی کی ہے، یعنی مفاد پسند عناصر کا اتحاد سیاسی، معاشی بنا پر؛ چنانچہ اس پارٹی کے سامنے صرف زمینداروں کا مفاد ہے۔'' ارشاد ہوا ''ذرا سوچیے تو سہی یہ پارٹی بظاہر مسلمانوں کی نمایندگی کر رہی ہے۔ اس میں اکثریت بھی مسلمانوں کی ہے، لیکن اس کے مسلمان عناصر اسلام ہی کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان نہ اس سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے، نہ تقویت۔ ہاں فائدے میں ہیں تو چند اہلِ غرض اور ان کی کوشش بھی یہی اپنی جماعت مضبوط کرتے چلے جائیں۔''

گفتگو یونینسٹ پارٹی پر آ گئی۔ سوال پیدا ہوا کہ اس پارٹی کا زور کیسے ٹوٹے گا۔ اس کے پاس حکومت ہے اور حکومت کے زور پر وہ دوسروں کو خرید بھی سکتی ہے؛ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ یہی دو چیزیں اس کی طاقت کا راز ہیں۔ بڑے بڑے بہی خواہان قوم ذاتی لالچ میں آ کر اسی کی طرف کھنچتے چلے جا رہے ہیں۔

ارشاد ہوا ''اگر میرا خیال غلط نہیں تو حکومت اور روپیہ ہی وہ چیز ہے جو بالآخر اس کے زوال کا موجب ہوگا۔ جیسے جیسے یونینسٹ پارٹی کی گرفت بڑھتی جائے گی ویسے ہی عامۃ المسلمین اس سے بدظن ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ محسوس کریں گے کہ اس پارٹی کا وجود ان کی

عزت اور خودداری کے راستے میں حائل ہے۔ جیسے جیسے کانگریس متحدہ قومیت کی آڑ میں اپنا دست تغلب دراز کرے گی مسلمان خود ہی ان جماعتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے جن کا دانستہ یا نادانستہ خیال ہے کہ ہندو اور مسلمان باہم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔'' فرمایا ''قوموں کی زندگی کا راز اس جدوجہد میں مضمر ہے کہ اپنا وجود ملی قائم رکھیں اور نہیں بھولیں کہ ان کا ایک اپنا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہماری جداگانہ قومیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے ہمیں اپنے موقف کا اعلان دلیری سے کرنا چاہیے۔''

حضرت علامہ نے پھر فرمایا'' دراصل ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اپنا ملی نصب العین صحت کے ساتھ متعین نہیں کر سکے۔ ہماری نظر زیادہ تر اخلاقی اور مذہبی مسائل پر رہی اور ہم سمجھے کہ یہی بہ مقابلہ دوسروں کے ہمارا مابہ الامتیاز [۲۷] ہے۔ اس میں کچھ حالات کو بھی دخل ہے، کچھ ہمارے زوال اور تاریخی روایات کو۔[۲۸] یہی وجہ ہے کہ ہم وہ قیادت پیدا نہ کر سکے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے۔[۲۹] ارشاد ہوا'' ہندی اور اُردو کے نزاع سے لے کر جب سالہا سال ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ سرسیّد کا یہ قول کہ ہمارا اور ہندوؤں کا راستہ الگ الگ ہے حرف بحرف صحیح ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مفاہمت تو کر سکتے ہیں کہ باہم صلح و آشتی کی زندگی بسر کریں، ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتے، سیاست کے ایک نہیں کئی دور گزر گئے۔ پھر بھی مسلمان نہیں سمجھے، اور یہ آئے دن کے بلووں، یا سماجی، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے باوجود جن سے ہندو مسلم اتحاد اور آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد کی تحریک ایک خواب پریشان بن کر رہ گئی کہ ان کا ملی نصب العین کیا ہے۔ وہ اپنی سیاست میں کیا لائحہ عمل اختیار کریں۔ بایں ہمہ ان کا یہ احساس کہ ہمارے اور ہندوؤں کے مطمح نظر میں ایک بنیادی فرق ہے قائم رہا۔ یہ احساس اس وقت بھی قائم تھا جب ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی اور اس وقت بھی جب کانگریس نے علی الاعلان مسلمانوں کی جداگانہ قومیت سے انکار کیا۔ جب نہرو رپورٹ پیش کی گئی اور جب اس سیاسی محاذ کے ساتھ ساتھ قومی تعلیم اور قومی زبان کے نام سے ایک نیا محاذ ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اخلاق و معاشرت کے خلاف قائم کیا گیا۔ یہی احساس تھا جس نے گول میز کانفرنسوں میں مسلمان مندوبین کو باوجود اختلاف رائے یک جا رکھا اور کانگریس کی وہ سازش جو نیشنلسٹ مسلمانوں کی آڑ میں اس نے ہمارے جداگانہ وجود

ملی کے خلاف کی تھی ناکام رہی۔'' فرمایا ''نیشنلسٹ مسلمانوں کا موقف بڑا غلط ہے۔''

اس پر جب یہ عرض کیا گیا کہ ان میں تو بڑی بڑی مقتدر اور قابلِ قدر ہستیاں شامل ہیں جن کے خلوص و دیانت اور خدمات قومی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو فرمایا ''تعجب تو انھیں کی سمجھ بوجھ پر ہے۔ وہ اپنی ہوش مندی، تجربے اور سیاست دانی کے باوجود قوم کو ایک بڑے غلط راستے کی طرف لے جا رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کسی بہت بڑے خوش آیند فریب میں مبتلا ہیں، یا پھر محض جذبات کے رَو میں بہہ رہے ہیں۔''

ارشاد ہوا ''رہا یہ سوال کہ ان میں علما کا ایک گروہ بھی شامل ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات میں اگرچہ ان کی مخصوص فرقہ بندی اور انگریز دشمنی کو بھی دخل ہے، لیکن اس کی اصل وجہ ہے برسوں کی تعطل اور سیاست سے بے تعلقی کے خلاف وہ ردعمل جو انھیں مجبور کر رہا ہے کہ سیاسی اعتبار سے بھی اپنی ہستی منوائیں۔ لہٰذا وہ یہ سمجھے بغیر کہ انھیں جس منصب کا دعویٰ ہے اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں محض ایسی جماعت کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم رکھنا چاہتے ہیں، لیکن یہ جماعتی مفاد کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم رکھنا چاہتے ہیں، لیکن یہ جماعتی مفاد کا اس درجہ پاس ہمارے ملی مفاد کے منافی ہے۔''

گول میز کانفرنس کا ذکر آ گیا۔ حضرت علامہ کی رائے تھی کہ مسلمان مندوبین میں اگرچہ کامل اتحاد تھا، بایں ہمہ وہ پورے طور پر قوم کی نمایندگی نہیں کر سکے۔ ان کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہر فریق کی نیابت ہو جائے، لہٰذا ان میں بعض کی موجودگی گویا برائے بیت تھی۔ ارشاد ہوا ''غنیمت ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد قائم رہا، ورنہ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔''

قیام انگلستان کی باتیں ہونے لگیں، رفقائے سفر کی اور اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا ''لندن سے واپسی پر ہمارا جہاز عدن پہنچا تو مولوی شفیع داؤدی[۳۰] عرشہ جہاز پر کھڑے گرد و پیش کے مناظر کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی جو اتفاقاً سمندر میں گر گئی۔ مولوی صاحب پریشان ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں کہ دفعتہً ان کی نگاہیں ان صومالی[۳۱] لڑکوں پر پڑی جو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر ادھر ادھر گھوم رہے تھے تاکہ مسافر چاہیں تو انھیں اپنی غوطہ خوری کے کرتب دکھائیں۔ مولوی صاحب

اس تفسیر کا جو مولانا نے فرمائی اور جس سے برہمو سماج کے نقطۂ نظر ہی کی تائید ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی دینی عصبیت کو تو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔ مولانا کے ارشادات کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اسلام اور غیر اسلام میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہتا۔ نہ عقیدۃً، نہ عملاً۔ معلوم ہوتا ہے ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ مذہباً کانگریس کی حمایت کا جواز پیدا کیا جائے تاکہ ہم اپنے اس دعویٰ سے کہ مسلمانوں کی ایک جداگانہ قومیت ہے دستبردار ہوجائیں۔ مولانا کے عقاید، مولانا کے خیالات، اور مولانا کے نظریات میں یہ تبدیلی افسوسناک بھی ہے اور تعجب انگیز بھی۔

پرویز صاحب نے کہا مولانا گویا دبی زبان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ قوم کا معاملہ مذہب سے الگ ہے۔[۳۴] انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا کی تفسیر شائع ہوئی تو رسالہ معارف میں ان کے قلم سے ایک طویل تبصرہ بھی شائع تھا۔[۳۵]

حضرت علامہ نے فرمایا ''مدیر معارف[۳۶] نے بھی کیا اس سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کی؟

پرویز صاحب نے کہا کہ شروع میں تو سیّد صاحب نے اس تبصرے کی بڑی تعریف کی اور ان خطرات کا اقرار بھی کیا جن کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا تھا، لیکن تبصرے کی دوسری قسط کا وقت آیا تو انھوں نے دفعتہً اپنی رائے بدل دی۔

'کیوں؟'

''اس عذر میں کہ مولانا کی فضیلت علم اور بصیرت فی الدین مسلم ہے۔ وہ بہت بڑے سیاسی اور دینی رہنما ہیں۔ ان کے خیالات پر گرفت کی گئی تو بہت ممکن ہے اور زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہوجائیں۔ مصلحت یہی ہے کہ سرِدست خاموشی اختیار کی جائے۔ مولانا کا شاید وہ مطلب بھی نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔''[۳۷]

ارشاد ہوا ''یہ اَمر بڑا افسوس ناک ہے کہ کسی شخص کا علم و فضل یا احترام ذات ہمیں حق گوئی سے باز رکھے اور وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہے۔''

چند منٹ خاموشی رہی۔ شاید مولانا کی تبدیلی، خیالات پر دل افسردگی کے باعث۔ پرویز صاحب نے پھر کہا بعض لوگ کہتے ہیں قرآن پاک نے سامی ذہن کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے نزدیک سامی ذہن قانونی ذہن ہے، لیکن قانون کا انکشاف تو بتدریج ہورہا ہے۔ اس کا تعلق ہمارے علم سے ہے، عقل اور تجربے سے۔ جیسے جیسے احوال میں تبدیلی رونما ہوتی ہے

قانون آپ سے آپ بدل جاتا ہے۔ چنانچہ کتنے حقائق ہیں جو زمانہ حال کے اشترا کی انقلاب سے منکشف ہونے اور جن کے پیشِ نظر مخالفین اشترا کیت کو بھی بعض باتوں میں اپنا موقف بدلنا پڑا۔ یوں بھی خیال ہے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا اور بھی کئی حقائق منکشف ہوں گے اور ایسا ہوا تو قانون کے بارے میں بھی ہمارا رویہ بدل جائے گا۔ اندریں صورت ہم کیا کہیں۔ ہماری ضرورت کیا ہے، قانون یا تصورات؟

پرویز صاحب کا سوال اگرچہ واضح نہیں تھا۔ انھیں شاید خیال نہیں رہا وہ لفظ قانون کو کن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس بنیادی فرق کو بھی نظر انداز کر دیا جو حقائق کے تصور اور ان سے تمسک میں ہے اور جس سے ہمارا ذہن قانون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات اگرچہ صاف نہیں تھی کہ قانون سے ان کا مطلب کیا ہے اور تصورات سے کیا پھر بھی حضرت علامہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔[۳۸] انھوں نے فرمایا "یہ قانون اور تصورات کی بات ذرا سمجھنے کی ہے۔ بہر حال ہم آپ کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔" حضرت علامہ اتنا کہہ کر رُک گئے جیسے ذرا سستانا چاہتے ہوں اور گو انھوں نے اپنے اس ارشاد کی کہ قرآن میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی وضاحت نہیں فرمائی، لیکن میری سمجھ میں جو بات آئی یہ کہ قرآن مجید میں وہ سب کچھ ہے جس سے بیک وقت ہماری رہنمائی قانون اور تصورات دونوں میں ہوتی ہے۔ بہر کیف انھوں نے قدرے توقف کے بعد پھر فرمایا "اس معاملے میں قابلِ غور اَمر یہ ہے کہ قرآن پاک عین فطرت ہے۔[۳۹] لہٰذا فطرۃ اللہ کا انکشاف جس پر انسان کو پیدا کیا گیا[۴۰] قرآن ہی کے ذریعے ہوا۔ پھر یہ فطرت اس نظام حیات ہی میں مشہود ہوئی جس کو اس نے دین کہا ہے[۴۱] اور دین کا تقاضا ہے وہ اعمال وعقاید جو ہر پہلو سے زندگی کو سہارا دے رہے ہیں اور جن کو اصطلاحاً شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۴۲] لہٰذا ہم کہیں گے قرآن پاک میں قانون بھی ہے اور تصورات بھی۔ گو انسان کو تصورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی قانون کی۔"[۴۳]

ارشاد ہوا "یہ انسان کی عقل، اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جس میں قرآن مجید کا قانون حیات منکشف ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا،[۴۴] لیکن وہ ہے تو اس میں تمام وکمال موجود۔ جب ہی تو قرآن پاک نے دعوے سے کہا 'فاتوا بسورۃ من مثلہ'[۴۵] یہ دوسری بات ہے کہ نفس متناہیہ

دماغ کی اختراع ہیں۔ ان کو وضع کیا گیا تو کسی مطلب کے لیے۔[۵۶] یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں حقائق کی تصدیق کی وہاں انسانوں کو نظر انداز کر دیا اور اگر نہیں بھی کیا تو اس حد تک ترمیم اور قطع و برید کے ساتھ کہ ان سے جن حقائق کی ترجمانی مقصود ہے ان کی طرف واضح طور پر اشارہ ہو جائے۔'' ارشاد ہوا ''مثال کے طور پر آدم و حوا کا افسانہ ہے قرآن مجید نے اس کے بیان میں ایک نیا انداز اختیار کیا۔''[۵۷]

ہم سب خاموشی سے حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے تھے۔ انھوں نے پھر فرمایا ''مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اگر قرآ
ن کسی افسانے کا ذکر نہ کرے جب بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اشارہ کس افسانے کی طرف ہے، مثلاً قرآن میں ہے ہم نے کائنات کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔[۵۸] اس سے ہمارا ذہن خود بخود اس افسانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ہندوؤں میں رائج ہے اور جس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ دنیا کیا ہے؟ ایک کھیل جسے رام نے اپنی دل لگی کے لیے رچایا۔''[۵۹]

فرمایا ''ہندوؤں کے یہاں ایک دیوتا ہے جس کا نام ہے 'نٹ راجن'، یعنی کھلاڑیوں کا راجا۔ وہ اس کی مورتی بھی تیار کرتے ہیں تو اس طرح جیسے یہ دیوتا راگ رنگ میں مشغول ہے۔''[۶۰] ارشاد ہوا ''ایسے ہی صفات باری تعالیٰ کے ذکر میں جب قرآن یہ کہتا ہے ''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ''[۶۱] تو بے اختیار ہندوؤں کا یہ قول یاد آ جاتا ہے کہ کائنات پر ماتما کا خواب ہے۔ ادھر اس کی آنکھ کھلی اور اُدھر یہ خواب پریشان ہو گیا۔'' فرمایا ''ہمارے ہاں بعض صوفیہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔''[۶۲]

حضرت علامہ کچھ تھک سے گئے تھے۔ مولانا نے بھی اس خیال سے کہ انھیں آرام ملے دو چار کلمات ان کی تائید میں کہے۔ علی بخش آیا۔ حسبِ معمول تکیوں کو ہٹاتے ہوئے حضرت علامہ کے شانے دابنے لگا۔ دوا کھلائی اور چلم بدلی۔ حضرت علامہ نے پھر فرمایا ''میں نے کہا تھا قرآن مجید دل کے راستے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر

ہے والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے، میں تلاوت میں مصروف تھا، مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رُک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے تم کیا پڑھا کرتے ہو۔ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انھیں معلوم تھا میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ عرض کیا قرآن پاک۔ کہنے لگے تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا آخر اس سوال سے اُن کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوگی، لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسبِ معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا، والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے، بیٹا قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اُس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے تمھیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمھاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا، بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں جیسے اُن کا ارشاد ہے کہ انھوں نے کہا سنو، اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کہ خاتم الانبیا ہیں، جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذاتِ محمدیہ کی تشکیل پر ہوا۔[۶۳]

حضرت علامہ کہنے لگے "والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی۔ انھوں نے کہا شعور انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پا لے[۶۴] تو ذات محمدیہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ

علیہ وسلم تشریف لائے، باب نبوت بند ہوا، انسانیت اپنے معراج کمال کو پہنچی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب ہے میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔[۶۵]

سلسلۂ کلام نبوت پر آ گیا۔ نبوت سے مقصود ہے فرد کی تربیت ذات اور فرد اور جماعت کی رہنمائی مدارج کمال کی طرف۔ ارشاد ہوا ''جہاں تک فرد کی ذات اور معاشرے کی تہذیب و ترقی یا دوسرے لفظوں میں معراج انسانیت کا تعلق ہے یہ مقصد حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے حاصل ہوگا'[۶۶] البتہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی نصب العین ہو اس کے لیے یقین کامل شرط ہے۔ یقین نہیں تو عمل بھی نہیں، نہ آرزو، نہ ولولہ، نہ جدوجہد۔'' فرمایا ''شعور نبوت کو تو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں زمانے کی ساری وسعتیں سمٹ کر ایک نقطے پر آ جاتی ہیں۔ ماضی و حال اور مستقبل کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ لہٰذا ہمارے لیے جو بات آنے والی ہوتی ہے شعور نبوت کو پہلے ہی سے اس کا علم ہوتا ہے، اس طرح جیسے اس کا ظہور ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام ہر حقیقت اور ہر صداقت کو اپنے سامنے عیاں دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے وحی الٰہی میں ان کے یقین کامل کی۔ لہٰذا جس علم کا سرچشمہ ہے وحی الٰہی اس میں یقین ہی یقین ہوگا۔ اس کے برعکس عقل اور فکر کی دنیا ہے کہ ہم اس میں قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اس میں اثبات کے ساتھ نفی اور یقین کے ساتھ ظن کا پہلو قائم رہتا ہے۔ فلسفہ نام ہے انسان کی دماغی کاوشوں کا لیکن یہ کاوشیں آخر انسانی ہیں۔ ان میں یقین کا رنگ پیدا نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص وہ یقین جسے ہم علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین سے تعبیر کرتے ہیں۔ فکر میں یقین کا رنگ پیدا ہوگا تو وحی الٰہی کی بدولت کہ اس کی رہنمائی میں آگے بڑھے'' ارشاد ہوا ''یہ رہنمائی ازل سے ہماری فطرت میں ودیعت ہے۔'[۶۷]

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ حضرت علامہ کو آرام کی ضرورت تھی۔ انھوں نے پاؤں پھیلا کر تکیوں پر ٹیک لگائی۔ مولانا حضرت علامہ کی تائید میں کچھ کہہ رہے تھے کہ پرویز صاحب نے کہا قرآن کریم میں ہے ایک وقت آئے گا جب لوگ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے۔[۶۸] جب تیرا رب اور ملائکہ صف بہ صف آئیں گے[۶۹] جیسے خدا زمین پر اتر آئے گا۔ جب

زمین تیرے رب کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔[۷۰] ان آیات کا اشارہ کس حقیقت کی طرف ہے۔ کیا اس خاکدان میں ابھی کوئی اور کھیل کھیلا جائے گا؟

پرویز صاحب کے اس سوال کو ہم نے بڑی دل چسپی سے سنا اور منتظر تھے کہ حضرت علامہ اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں۔ بالخصوص اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے ملاحدہ کے علاوہ بعض فلاسفہ اسلام نے بھی ان آیات کی تاویل بڑے غیر اسلامی رنگ میں کی ہے، حتیٰ کہ بابیوں اور بہائیوں نے تو انھیں عجیب وغریب معنی پہنچائے ہیں۔[۷۱]

حضرت علامہ کوئی جواب دینے نہیں پائے تھے کہ پرویز صاحب نے پھر کہا، قرآن پاک نے یہ بھی کہا ہے جس روز یہ ارض وسما بدل کر کچھ اور ہو جائیں گے۔[۷۲] ہم ان آیات کا مطلب کیا سمجھیں؟

حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ ارض وسما، یہ بلندی و پستی، یہ جو کچھ بھی ہے ہم اس کا ادراک اپنے شعور ہی کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان کا تصور ہمارے شعور کا تاج ہے۔ جس روز یہ شعور بدلا ارض وسما بھی بدل جائیں گے۔ قرآن پاک کا خطاب ہمارے شعور ہی سے تو ہے۔ یہ ہمیں ہیں جن کو کوئی حقیقت سمجھائی جا رہی ہے۔'' ارشاد ہوا ''سرِدست ہم اپنے ارتقا کی ایک منزل میں ہیں۔ اس سے آگے جو منزل ہے اس میں قدم رکھا تو شعور کی تبدیلی سے ارض وسما بھی بدل جائیں گے۔ معلوم نہیں اس وقت ارض کیا ہو اور سما کیا۔ جب ہی تو فرمایا جس روز یہ ارض وسما کچھ اور ہو جائیں گے۔''

فرمایا ''شعور میں بھی تو ارتقا جاری ہے اور ارتقا کا تقاضا یہ ہے کہ زمان و مکان کے ابعاد ختم ہو جائیں۔'' ارشاد ہوا ''خواب میں یہ ابعاد اکثر ختم ہو جاتے ہیں۔ سال کا واقعہ ثانیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مسافتوں کا پتا نہیں چلتا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔''

فرمایا ''میں یہ سب کچھ مثالاً کہہ رہا ہوں۔ ورنہ کیا معلوم شعور کے ارتقا سے کیا کیا تبدیلیاں مترتب ہوں۔''

پھر فرمایا ''ان آیات میں جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کا فہم تو آسان ہے، لیکن غلطی یہ ہے کہ ہم ان کی تاویل شعور کے اس مرحلے کی رعایت سے کرتے ہیں جس سے سرِدست ہمارا گزر ہو رہا ہے، حالانکہ تاویل سے مقصود کسی حقیقت کو سمجھنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ہے۔'' ارشاد ہوا ''تاویل اور موضوعِ تاویل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے، ایک منطقی، حقیقی اور واقعی

رشتے کا تعلق یہ نہیں کہ ہم اسے اپنے ہی خیالات اور مزعومات کی تائید کا ذریعہ بنائیں۔" [۳]

جاوید نامہ کا ذکر آ گیا۔ پرویز صاحب نے کہا دربار فرعون کے ساحر کیسے پختہ ایمان تھے۔ فرعون کے جبر و استبداد کا جواب ان کی پختہ ایمانی سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ آپ نے انھیں جاوید نامہ میں کوئی جگہ نہیں دی۔ [۴]

فرمایا "جاوید نامہ میں بہت سی باتوں کا ذکر رہ گیا۔ میرا تو جی چاہتا تھا سیّد احمد بریلوی اور سیّد احمد دہلوی [۵] کی روحوں کو بھی اس میں جمع کر دوں، لیکن خیال نہ رہا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی باتیں میرے ذہن میں ہیں، بلکہ میں نے بہ طور یادداشت کہیں لکھ بھی رکھا ہے۔ موقع ملا تو ان کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔" [۶]

نیٹشے اور برگساں کی باتیں ہونے لگیں، شاید اس لیے کہ کل کے جلسوں میں جو مقالے پڑھے گئے ان میں نیٹشے اور برگساں کا اکثر ذکر آیا۔ ارشاد ہوا "میرے اور نیٹشے کے نقطۂ نظر میں بنیادی فرق ہے۔ نیٹشے کی طبیعت پر مادیت پسندی کا غلبہ تھا۔ اس نے ہستیِ باری تعالیٰ کا انکار کیا اور اس انکار سے خودی کا انکار لازم ٹھہرا۔ وہ خودی کا منکر ہے۔ خودی اس کے نزدیک کوئی مابعد الطبیعی حقیقت نہیں۔ اس کا فوق البشر بھی قدیم یونانی سورماؤں کا نمونہ ہے۔ وہ ہمیشہ کسی آنے والے کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ مجوسی خیالات کا اثر ہے گو تعجب ہے کہ مجوسیت سے اثر پذیری کے باوجود اسے زمانے کی حقیقت سے کیوں انکار ہے۔ ہندوؤں اور یونانیوں کی طرح زمانے کی حرکت بھی اس کے نزدیک دوری ہے اور نتیجہ یہ کہ ہر چیز بار بار آتی رہتی ہے۔" [۷] فرمایا "نیٹشے کی ساری خوبی ذات انسانی کے لیے اس کے ذوق و شوق، اس کے سوز و ساز اور جذب و گداز میں ہے۔ [۸] افسوس ہے اسے کوئی مرد کامل نہ ملا۔"

ارشاد ہوا "تصوف بھی اب چند رسمی باتوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ صوفیہ خود بھی نہیں جانتے انھیں ماضی سے کیا ورثہ ملا۔" فرمایا "تصوف کیا ہم اپنے فکر و فرہنگ، ادب اور فن سب سے بے خبر ہیں" اور حضرت علامہ کا یہ ارشاد تھا بھی ٹھیک اس لیے کہ نیٹشے اور برگساں کے سلسلے میں ان کے افکار کی جو تنقید کی جاتی اس کا انداز یا تو مناظرانہ ہوتا، یعنی محض بحث برائے بحث، یا مغرب سے مرعوبیت کے باعث تنقید نگار سمجھتا کہ افکار حاضرہ مغرب ہی کا اجارہ ہیں [۹] یا پھر اسلامی علم و حکمت اور معارف سے بے خبری [۱۰] کہ ہماری درس گاہوں میں تعلم و تربیت کا انداز

۱۱- نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے
بال جبرل

۱۲- فَلْيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لِلنَّاسِ......(الحج)

۱۳- حضرت علامہ کا ارشاد ہے:
حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست طواف او طواف بام و در نیست
میان ما و بیت اللہ رمزیست کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

۱۴- مرحوم الٰہ آبادی، تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن۔

۱۵- وہابی عقاید کی جبری اشاعت کے باعث۔

۱۶- محمد ابن عبدالوہاب نجدی جیسا کہ حضرت علامہ کی رائے تھی، دیکھیے خطبات، چھٹا خطبہ۔

۱۷- حوالہ مذکور، اُوپر کے حاشیے میں۔

۱۸- ۱۷۴۵ء میں شرفائے مکہ اور ۱۸۰۳ء میں دولتِ عثمانیہ سے۔

۱۹- اس لیے کہ بجائے آزادیِ اجتہاد کے اس نے فقہ حنبلی کی کورانہ تقلید اختیار کی اور پھر قدامت پسندی کا شکار ہوگئی، دیکھیے اس سلسلے میں خطبات ، چھٹا خطبہ، الاجتہاد فی الاسلام۔

۲۰- یہ سب واقعات ۱۹۲۵ء کے ہیں، دیکھیے ضمیمہ۔

۲۱- ۱۹۲۶ء میں۔

۲۲- ۱۹۲۲ء میں اتاترک کے ہاتھوں۔

۲۳- بحمد للہ کہ مولانا کے یہ خیالات بھی جیسا کہ واقعات سے تصدیق ہوتی ہے صحیح ثابت ہوئے۔

۲۴- سلطان کے زیر اہتمام بدوی قبائل کی آبادکاری کے لیے۔

۲۵- چنانچہ حضرت علامہ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

۲۶- اور مسلمان سمجھ بھی نہیں رہے تھے، بالخصوص جب نیشنلسٹ مسلمان، احرار اور کانگریس کی طرف دار جمعیۃ العلما اس سے انکار کر رہی تھی۔ یا اس کی تعبیر اس رنگ میں کرتی کہ اس کے لیے کسی جداگانہ قومی تنظیم کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ ہم ترقی پسند دنیا کا ساتھ دیں۔

۲۷- اور امر واقعی بھی یہ ہے کہ حضرت علامہ جس دور کا ذکر کر رہے ہیں اس میں کسی کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ اسلام ایک نظام مدنیت اور اجتماع و عمران بھی ہے اور آج بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔

۲۸- بسبب فرقہ بندی کے۔

۲۹- حالانکہ عملاً نہ سہی اُصولاً حضرت علامہ مسلمانوں کی قیادت فرما رہے تھے۔

۳۰- بہار میں تحریکِ خلافت کے پر جوش رہنما اور سابق ہندوستان میں مرکزی اسمبلی کے رکن۔

تعبیر کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ خود مسلمان بھی اس پہلو سے شریعت کی قدر و قیمت سے بے خبر ہیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں:

شکوہ سنج سختی آئین مشو | از حدود مصطفیٰ بیروں مشو

۳۹۔ نیچر (Nature) کے معنوں میں نہیں جو سائنس کا ایک خود ساختہ مفروضہ ہے اور جس کے پیش نظر حامیان مذہب عالم کائنات کو صحیفہ قدرت ٹھہراتے ہوئے اکثر اس سے استشہاد کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسلام 'دین فطرت' ہے۔ ان معنوں میں کہ اس نے ہمیں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے، یعنی عالم کائنات (فطرت) پر نظر رکھنے اور قوانین فطرت کے اتباع کا سبق دیا۔ ہمیں معلوم ہے سرسیّد نے اس طرز فکر پر بالخصوص زور دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مخالفین نے انھیں نیچری کہا اور ان کے مذہبی غور و فکر کے لیے نیچریت کی اصطلاح وضع کی۔

۴۰۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔۳۰ (الروم):۳۰۔

۴۱۔ فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی۔ فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم لا و اکثر الناس لایعلمون۔۳۰ (الروم):۳۰۔

۴۲۔ شرع لکم من الدین ماوصی بہ نوحاً...... ان اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیہ۔۴۲ (الشوریٰ):۱۳۔

۴۳۔ انسان کو ثبات کی طلب ہے | دستور حیات کی طلب ہے

بانگ درا

۴۴۔ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ:۵۳)۔

۴۵۔ ایسی کوئی سورہ لاؤ (البقرہ:۲۴)۔

۴۶۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (العنکبوت:۱۶)۔

۴۷۔ ولقد خلقنا السموات والارض و مابینھما فی ستۃ ایام ومامسنا من لغوب۔۵۰ (ق):۳۸۔

۴۸۔ اس لیے کہ خداوند اسم ذات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسم ذات کی تلاش میں اب عیسائیوں کے ایک فرقے نے یہواہ (Jehova) کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

۴۹۔ مایا بمعنی فریب، التباس، نمود۔ ویدانت فلسفہ کی اصطلاح میں عالم محسوسات کی کثرت ایک فریب ہے جس نے اصل حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اصل حقیقت ایک ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بسبب 'مایا' (جہالت) ہمیں اس کا ادراک نہیں ہوتا، لیکن اس پر ایک ہندو فلسفی یوں رائے زنی کرے گا کہ بیشک عالم کائنات 'مایا' ہے کیوں کہ اس میں اصل حقیقت چھپ گئی ہے لیکن جہاں تک اصل حقیقت کے اظہار کا تعلق ہے مایا ہی حقیقت ہے کہ اس میں اس کا اظہار ہو رہا ہے۔

انند۔ روحانی کیف و سرور کی انتہائی کیفیت جس میں شاہد و مشہود کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ کیف و سرور کا ابدی لمحہ۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغ یک محمد بر فروخت

حضرت علامہ نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی۔ الفاظ تھے۔ Mohammad in the making

۶۴- اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدہ:۳)۔

۶۵- بال جبریل میں ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

۶۶- دیکھیے اس سلسلے میں رموز بیخودی کے ابواب رسالت، تادب بآدب محمدیہ اور حفظ روایات ملیہ بالخصوص۔

۶۷- قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ:۵۱)۔

۶۸- فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (یٰسین:۵۱)۔

۶۹- وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (الفجر:۲۲)۔

۷۰- وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (الزمر:۶۹)۔

۷۱- مثلاً یہ کہ عہد نبوت ختم ہو چکا ہے لہٰذا شریعت اسلامیہ منسوخ ہوگئی۔

۷۲- یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ (ابراہیم:۴۸)۔

۷۳- ابن حزم کی طرح حضرت علامہ بھی تاویل کے قائل نہیں تھے جیسا کہ اس کا عام مفہوم ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

کردۂ تاویل حرف بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را

تاویل کے معنی ہیں رجوع الی الاصل۔ جو تاویل اصل سے ہٹ گئی وہ تاویل نہیں ہے۔

۷۴- چنانچہ مولانا محمد علی ساحران دربار فرعون کی مثال پیش کرتے ہوئے شہنشاہیت پر بڑا دلچسپ تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے شہنشاہیت کی روح جبر و استبداد کا اندازہ اس اَمر سے کیجیے کہ جب ساحروں نے کہا ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے تو فرعون نے کہا تم بغیر میرے حکم کے کیسے ایمان لے آئے۔ تم اور یہ جرأت۔

۷۵- سر سیّد احمد خان۔

۷۶- اور واقع بھی یہ ہے کہ حضرت علامہ جو دواوین اشعار شائع کرتے خاصی قطع و برید اور ترمیم و تنسیخ کے بعد۔ ایسے ہی بعض نامکمل عنوانات حذف کر دیتے، اس امید میں کہ آیندہ ترتیب میں مکمل ہو جائیں گے۔

۷۷- اشارہ ہے نیٹشے کے عقیدہ رجعت ابدی کی طرف۔

۷۸- نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کف خاکے کہ می سوزد ز جان آرزومندے

۷۹- چنانچہ ایک صاحب کاغذوں کا ایک طومار لیے پھرتے تا کہ وہ دکھا سکیں کہ اقبال کا اپنا تو کوئی خیال تھا

یقیناً خدا کی یہ شان نہیں ہوسکتی جس پر مسیحیت کو اصرار ہے خواہ اس کی تعبیر کسی رنگ میں کی جائے۔ وہ فلسفہ کے واجب الوجود سے بھی بیزار تھا اس لیے کہ واجب الوجود ایک منطقی برہان ہے۔ ایک استدلال، ایک نتیجہ۔ بالفاظِ دیگر ایک وہم اور خیال یا از روے منطق ایک معنی (concept) جس کی بنا وجود و عدم اور وجوب و امکان کے پیشِ نظر ایک خاص قسم کے صغرا و کبرا یعنی قیاس منطقی پر رکھی گئی اور جس سے ایک مخالفانہ مگر ویسی ہی صحیح منطق سے استدلال کرتے ہوتے انکار بھی کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا واجب الوجود ہمارے ذہن کی پیداوار ہے اور ہمارے ذہن ہی میں محدود جس کی اس سے باہر کوئی حقیقت ہے، نہ وجود۔ واجب الوجود خدا کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ یوں ایک خاص قسم کے فکر اور منطق کا تقاضا تو پورا ہو جاتا ہے لیکن مذہب کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ از روے منطق یہ ہستی باری تعالیٰ کی ایک دلیل تو ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ دلیل نہیں بلکہ امکان جسے دلیل ٹھہرانا منطق ہی کی اصطلاح میں مصادرہ علی المطلوب Petitio Principil کہا جائے گا کیونکہ اس امکان کی صحت ہی تو ثبوت طلب ہے۔

وجود Being اور واجب الوجود Necessary being کے پیشِ نظر میکٹیگرٹ نے 'وجود مسحوق' Pulverised Being کا تصور قائم کیا اور وہ بھی شاید جواباً۔ وہ کہتا ہے کائنات مجموعۂ افراد (موجودات) ہے اور ہر وجود دوسرے سے الگ جس میں ابھی وحدت کی شان پیدا نہیں ہوئی۔ گویا وجود اگر ہے بھی (بطور ایک وحدت) تو یہ وحدت قائم نہیں۔ وجود پس گیا ہے اور بشکل موجودات ہمارے سامنے جس کا ہم خود بھی ایک حصہ ہیں۔ لہٰذا وحدۃ الوجود سے اس کا اختلاف کیونکہ وحدۃ الوجود سے موجودات کی نفی لازم آتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے وجود منطق کا ایک مقولہ ہے، مذہب کا مقولہ نہیں ہے۔ مذہب کو جس خدا پر اصرار ہے یا دوسرے لفظوں میں ہم جس خدا کو فی الواقعہ مان سکتے ہیں اس کا جواز نہ واجب الوجود سے پیدا ہوتا ہے، نہ مسیحیت کے شخصی خدا اور اقانیم ثلاثہ سے۔ لہٰذا میکٹیگرٹ کی دہریت اور ہستی باری تعالیٰ سے انکار۔ بایں ہمہ اس کی دہریت کا اپنا ایک رنگ تھا جس پر محبت کا غلبہ تھا اور جو شاید مسیحیت سے اسے ورثے میں ملا۔

❀......❀......❀

شرم ہے اسی کے بھروسے ان سے کچھ کہ بھی دیتا ہوں۔'' اور یہ کہتے کہتے آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ فرمایا ''ممکن ہے اس نام سے ان کا انتساب ہی کسی نہ کسی دن اُن کی زندگی کا رُخ بدل دے۔''[۵] میں خاموش ہوگیا۔

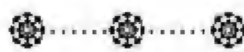

حواشی

۱- حکیم نابینا صاحب کا ارشاد تھا حضرت علامہ زیادہ تر پرند کا گوشت استعمال کریں۔ یہ بات کسی نہ کسی طرح پیر صاحب تک پہنچ گئی، لہٰذا ان کا ازرہ محبت وارادت یہ تحفہ۔

۲- جیسا کہ پیر صاحب نے فرمایا اور جیسا کہ ہمارے یہاں اس لفظ کے دو معنی ہیں (۱) انگریز یعنی جزائر برطانیہ اور (۲) ارض یورپ کا باشندہ۔

۳- بیگم حسین جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد بھی کئی سال گھر بار کی نگرانی کرتی رہیں۔ وہ جرمن نژاد خاتون تھیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ جرمنی واپس چلی گئیں ہیں۔

۴- دیکھیے بال جبریل کی نظم جو پیروں کی عام حالت پر لکھی گئی اور جس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے، 'پیری وصد عیب'۔

۵- باعتبار حسب ونسب کہ ہم آل رسول ہیں۔

ارشاد ہوا ''یہ حقیقی اسلام کی اصطلاح بھی خوب ہے۔ اسلام تو ہر حالت میں اسلام ہے اور اسلام ہی رہے گا کچھ اور تو ہو نہیں جائے گا۔ غیر حقیقی اسلام کو کون اسلام کہے گا۔ مسلمان خود بھی تو اسے اسلام نہیں کہتے۔'' فرمایا ''ڈاکٹر صاحب کا شاید یہ خیال ہوگا کہ ہمارا کردار اسلام کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ لیکن یہ ایک جداگانہ بات ہے۔ اسے حقیقی یا غیر حقیقی اسلام سے کیا تعلق؟ ڈاکٹر چکرورتی اگر تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام ہی وہ جامع اور ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے جس کی فی الحقیقت نوعِ انسانی کو ضرورت تھی اور جسے فطرت بھی قبول کرتی ہے تو ان سے کون کہتا ہے حقیقی اسلام کو چھوڑ کر کوئی غیر حقیقی اسلام قبول کر لیں۔''

ارشاد ہوا قرآن مجید سے بڑھ کر کسی کتاب کا یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں رشد ہی رشد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ اور غیّ[۳] کیا ہے حق و باطل کا امتزاج، کچھ ہدایت کچھ ضلالت'' فرمایا ''انسان کے لیے تعلق باللہ ضروری ہے۔ اسلام نے تعلق باللہ کا رشتہ ایک طرف علم اور دوسری جانب عمل سے جوڑا اور ہدایت کی کہ اُٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ذکر الٰہی ہوتا رہے[۴] اس میں جگہ کی قید ہے نہ وقت کی۔ اس نے باقاعدہ عبادت کو بھی ہر پہلو سے واضح اور متعین کر دیا''[۵]

حضرت علامہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن بہ سبب نقاہت رُک گئے۔ دم کشی کی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں پریشان تھا۔ مگر پھر طبیعت جلد ہی سنبھل گئی۔ سلسلہ کلام کا ربط اگرچہ ٹوٹ چکا تھا بایں ہمہ فرمایا ''قانون وراثت ہی کو دیکھ لو۔ اس میں بھی دولت کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں، خویش و اقارب، دوستوں اور ناداروں سب کا لحاظ رہے[۶] ارشاد ہوا ''دولت اور طاقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام نے اس اَمر کی پیش بندی نہایت خوبی سے کی کہ دولت حصول طاقت کا ذریعہ نہ بنے[۷] اور پھر طاقت کو بھی رد نہیں کیا۔ نہ دوسرے مذاہب کی طرح اسے مذموم ٹھہرایا۔ طاقت کی روح ہے جہاد[۸] مگر جہاد[۹] کے لیے بھی جو احکام وضع ہوئے اور ان کے مقصود و مدعا کی تعیین اس طرح کی گئی کہ جوع الارض کی بجائے جہاد صلح و آشتی کا ذریعہ بن گیا۔''[۱۰]

فرمایا ''اسلام نے ہر معاملے میں ایک فطری اور طبعی روش اختیار کی۔ اس لیے کہ اسلام کا مقصود ہے فرد اور جماعت کی تربیت۔ اس کا بہمہ وجوہ اور مسلسل نشو و نما۔'' فرمایا ''اسلام قوائے حیات کا شیرازہ بند ہے۔ اسلام ہی وہ ائتلاف[۱۱] ہے جس کی دنیا کو ضرورت تھی اور ہے۔''

❁……❁……❁

حق زبان پر لائیے تو اعتراض ہوتا ہے یہ اشتراکیت کی منطق ہے، اس سے مادیت اور لادینی کی بو آتی ہے۔ فرد کی صلاحیتوں، حریت اور آزادی پر زور دیجیے تو معترض سمجھتا ہے سرمایہ داری کی حمایت کی جارہی ہے۔ حضرت علامہ بتوجہ میری معروضات سن رہے تھے۔ فرمایا ''یہ جو کچھ کہہ رہے ہو تمھارے سوال کی تمہید ہے، سوال کیا ہے؟

میں نے طوالت کلام پر معذرت کرتے ہوئے عرض کیا، سوال یہ ہے کہ بحالت موجودہ ہمارے سامنے دو ہی نظام ہیں، اشتراکیت اور سرمایہ داری۔ دونوں ایک دوسرے سے متصادم، ایک دوسرے کی ضد۔ مگر دونوں اس اَمر کے دعویدار کہ انسان کی بھلائی انھیں میں ہے۔ اسلام بظاہر دونوں کے خلاف ہے۔ گو یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس میں شاید دونوں کی گنجایش ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نظام باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ اندریں صورت ہم کیا کہیں، اسلام کی روش سرمایہ اور محنت کے بارے میں کیا ہے؟ یعنی اس کے نظام اجتماع و عمران میں سیاست اور معاش کو باہم کیا تعلق ہے؟ بالفاظ دیگر وہ کیا نظام معیشت ہے جو از روے شریعت وجود میں آئے گا؟

ارشاد ہوا ''تم ابھی تک اپنا سوال متعین نہیں کر سکے۔ تم نے جو بات کہی وہ ایک طویل اور اُصولی بحث ہے۔ تمھارا ذہن اس بحث کی طرف منتقل ہوا، تو کیوں کر؟ تمھاری مشکل کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا زمین کی ملکیت اور عدم ملکیت کے مسئلے سے اس لیے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث میں سرِ دست یہی مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ کارخانہ داری کی تو ابھی ابتدا ہے۔ یہ مسئلہ طے ہو جائے تو بحیثیت ایک قوم ہم اپنا موقف بھی متعین کر سکیں۔ نہ یہ کہا جائے کہ دین سے انحراف ہو رہا ہے، نہ یہ کہ دین کیا ہے، محض سرمایہ داری کا پردہ۔

ارشاد ہوا ''زمین کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں۔ قرآن پاک نے صاف وصریح الفاظ میں کہہ دیا ہے الارض للہ۔[1] البتہ اس سلسلے میں جو مشکل ہے وہ یہ کہ اسلام جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں دین ہے، مذہب نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سیاسی معاشی مسائل کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک عمرانی تحریک بھی ہے۔ لیکن یہی نکتہ ہے جو ابھی تک لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو بے سروپا سوالات اُٹھائے جاتے ہیں اس کی وجہ بھی یہ کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ نظام مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا، لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعور ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے

یک شنبہ: ۲۳ ؍جنوری

آٹھ دن سیالکوٹ میں گزر گئے۔ آج شام کو واپس آیا تو نصیر میاں[1] نے کہا علی بخش ہر روز آتا ہے، کہتا ہے ڈاکٹر صاحب پوچھتے ہیں آپ کب آئیں گے؟ اس وقت آٹھ بج چکے تھے اور ہر چند کہ سفر کی کلفت سے طبیعت آرام کی طرف مائل تھی، مگر دل نہ مانا۔ تھوڑی دیر ٹھہرا اور حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

جاوید منزل پہنچا تو نو بج رہے تھے۔ اول صحن میں علی بخش سے علیک سلیک ہوئی۔ پھر حضرت علامہ کی خواب گاہ میں قدم رکھا اور سلام عرض کیا تو فرمایا آ گئے؟ میں نے عرض کیا ابھی واپس آیا ہوں اور آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حضرت علامہ ماشاءاللہ بڑے ہشاش بشاش نظر آتے تھے اور تکیوں کا سہارا لیے شفیع کو جو پلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پر بیٹھے تھے، کچھ لکھوا رہے تھے۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میری آمد پر چوں کہ سلسلۂ تحریر ٹوٹ گیا تھا، اس لیے شفیع نے ربط کلام کی خاطر پھر وہ الفاظ دہرائے جہاں پہنچ کر حضرت علامہ رُک گئے تھے۔ الفاظ یہ تھے 'ایک آزاد اور کھلی فضا میں پرورش پاتا ہے، مجھے نہیں معلوم تھا موضوع تحریر کیا ہے کہ حضرت علامہ نے خود ہی فرمایا ''مولوی حسین احمد کے اس غلط خیال کی تردید مقصود ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ شفیع کچھ یادداشتیں لے رہے ہیں۔'' سلسلہ تحریر آگے نہیں بڑھا۔ شاید اس لیے کہ یادداشتیں مکمل ہو چکی تھیں۔ شفیع اُٹھے اور کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا۔

میں نے عرض کیا ان دنوں مزاج کیسا رہا؟ فرمایا ''الحمدللہ اچھا ہوں۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔'' پھر میرے اتنے دنوں سیالکوٹ میں ٹھہرے رہنے کا سبب پوچھا۔ میں نے عرض کیا عدنان[2] کو بخار آ گیا تھا اس لیے مجبوراً رُکنا پڑا۔ فرمایا اب کیا حال ہے؟ عرض کیا بحمد للہ صحت ہے۔

ارشاد ہوا ''سیالکوٹ کی تقریب کیسی رہی؟'' میں نے اس کا مختصراً حال بیان کیا تو شفیع

میں اخبار تو دیکھ چکا تھا لیکن خبروں میں تازگی کہاں سے آتی۔ حالات اندرونی ہوں یا بیرونی کم وبیش وہی تھے جو چند دنوں سے چلے آ رہے تھے۔ جرمن سیاست پر تبصرہ ہونے لگا۔ ارشاد ہوا ''جنگ ناگزیر ہے۔''

سیّد بشیر الدین[۴] کا خط میری جیب میں تھا۔ میں نے عرض کیا مدراس میں بھی بسلسلۂ 'یوم اقبال' ایک جلسہ ہوا جس میں واتل صاحب[۵] نے بھی تقریر کی اور آپ کی نظموں 'فلسفہ غم' اور 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' سے بعض اشعار، بالخصوص ندی کی تشبیہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک طرح سے آپ نے بھی عقیدہ تناسخ کی حمایت کی ہے۔ یوں سیّد صاحب کے ذہن میں بھی ایک خلش پیدا ہوگئی لہٰذا ان کا خط:

ارشاد ہوا ''کیسی خلش؟''

یہ کہ اگر مادہ عبارت ہے کمتر خودیوں کی اس بستی سے جس سے ایک برتر خودی کا صدور ہوتا[۶] ہے تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس خودی کی تربیت نہیں ہوئی، یعنی جسے استحکام ذات حاصل نہیں ایسی خودی کیا بعد از موت کسی ادنی درجے کی خودی میں منتقل ہو جائے گی، یا کوئی دوسری شکل اختیار کر لے گی۔ بعینہٖ جیسے وہ خودی جس کی تربیت صحیح نہج پر ہوتی رہی مدارج کمال میں آگے بڑھتی رہے گی۔''

فرمایا ''واتل صاحب اور سیّد بشیر الدین دونوں میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ذاتی عقاید کی بنا پر تو ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ کسی خیال کی تعبیر جس طرح چاہے کرے[۷] لیکن میری نظموں کے بعض اشعار یا خطبات میں ارتقائے خودی کی بحث سے[۸] تناسخ کے حق میں استدلال کرنا غلط ہے۔''[۹]

ارشاد ہوا ''اس سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ خودی تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ ہر حالت میں خودی ہی رہے گی۔ اس کا جوہر ہے یکتائی۔ ہر خودی اپنی جگہ پر یکتا ہے۔ ہر خودی کا ایک تشخص اور ایک انفرادیت ہے کہ جب تک قائم ہے، خودی قائم ہے ورنہ اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔''

فرمایا ''نہ خودی کسی دوسری خودی میں مدغم ہو سکتی ہے، نہ اس کا ظہور کسی دوسری خودی کے طور پر ہوگا۔[۱۰] یہ نکتہ ہے جسے ان حضرات نے نظر انداز کر دیا۔ سیّد صاحب میرا مطلب نہیں سمجھے، واتل صاحب نے اس کی غلط تاویل کی۔

سے کس قدر مختلف ہے یہ تصور کہ خودی اگرچہ مخلوق ہے اور اس کی ایک ابتدا لیکن وہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت بھی ہے، اور اس کی انتہا یہ کہ جس طرح ایک نہیں کئی مرحلوں سے گزر کر اس کا صدور ہوا[۱۹] بعینہٖ کامل ذات کی جدوجہد میں ایک کے بعد دوسری منزل میں قدم رکھے۔[۲۰] موت وحیات اس کے احوال میں اور ان سے مقصود اس کی آزمائش[۲۱] کہ اپنا تشخص اور انفرادیت قائم رکھتے ہوئے بقائے دوام کی نعمت حاصل کرے۔ یوں تناسخ کے برعکس زندگی کا طبعی اور اخلاقی تقاضا ایک ہو جاتا ہے یعنی ایک ہی عمل کے دو رُخ اس لیے کہ خودی کی تخلیق عبث نہیں۔[۲۲] اس کی ایک غایت ہے اور یہ غایت سرتاسر اخلاقی۔[۲۳] حیات بعد الموت ایک انعام ہے[۲۴] تعزیر نہیں ہے بلکہ ایک نیا جولانگاہ تربیت ذات اور حصول ثبات واستحکام کے لیے۔ اندیشہ ہے تو یہ کہ خودی اپنی تربیت اور حفظ واستحکام سے غافل رہے۔ اسے ہر لحظہ فنا کی قوتوں کا ڈر ہے۔[۲۶]

گو تقاضائے فطرت یہی کہ اس کا وجود رائیگاں نہ جائے۔ کیا خوب کہا ہے حضرت علامہ نے:

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند ۔۔۔ آدم بمیرد از بے یقینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید ۔۔۔ مرگ است صیدے تو در کمینی[۲۷]

خودی چونکہ عین خود ہے اور ایک مابعد الطبیعی حقیقت، لہٰذا اس کی حرکت بھی صعودی اور ارتقائی ہے۔ عین خود نہیں اور مایا تو بہ پاداش عمل[۲۸] یہی حرکت نزولی اور دوری ہو جائے گی تاکہ کسی کمتر خودی میں جا گرے، یا پھر اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ بصورت اول اس کا ایک تشخص ہے اور ایک انفرادیت، لہٰذا اس کے احوال و واردات کا بھی ایک مرکز اور ایک تار جس سے بطور ایک وحدت اس کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ بصورت دیگر نہ مستقلاً کوئی مرکز، نہ مسلسل کوئی تاریخ۔ اس لیے کہ وہ نمود ہی نمود ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہے تو ظاہری اور وہمی–مایا۔

حیات بعد الموت پر گفتگو ہونے لگی۔ ارشاد ہوا ''قرآن پاک میں ہے جسد عنصری فنا ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔[۲۹] ہمیں خوب معلوم ہے ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا۔''[۳۰]

پھر فرمایا ''خودی کے لیے شاید کوئی جسد ناگزیر ہے، یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہمیں جسد کی بربادی کا غم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر یہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا، یہ ارشاد بڑا معنی خیز ہے، بلکہ ایک راز۔[۳۱] شاہ صاحب نے بھی تو جسد بعد الموت کے لیے نسمہ کی اصطلاح کی ہے۔[۳۲] ہندو ادب میں بھی اس طرح کا ایک لفظ موجود ہے۔''[۳۳]

ہوئے ابھی پچیس برس ہی گزرے تھے۔ میرے دادا بھی ان کی طرف داری میں انگریزوں سے لڑے تھے۔'' میں نے عرض کیا'' کہاں؟''

ارشاد ہوا'' گجرات میں''۔[54] فرمایا'' پنجاب میں ان دنوں علم وحکمت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے والد کو بڑی خواہش تھی مجھے تعلیم دلوائیں۔ انھوں نے اول تو مجھے محلے کی مسجد میں بٹھا دیا۔[55] پھر شاہ صاحب[56] کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس وقت کسے معلوم تھا میں ایک دن اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں میرا گزر ہوگا۔ علما وفضلا کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت تو یہ بھی معلوم نہیں تھا یونیورسٹی کیا ہوتی ہے، فیکلٹی کسے کہتے ہیں۔ یہ لفظ سننے میں بھی نہیں آئے تھے۔''

فرمایا'' میری باتوں کو سن کر...... کچھ خاموش سے ہوگئے۔ ایسے ہی ...... کا معاملہ ہے۔ ان سے...... ملاقات ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں بیدردانہ روپیہ خرچ کررہے ہیں۔ میں نے ٹوکا تو کہنے لگے کیا پرواہے...... کی دیر ہے، روپیہ ہی روپیہ ہوگا...... حسن اتفاق سے یہی کچھ ہوا لیکن......

میں نے عرض کیا'' تو ان کی مالی حالت سدھر نہیں سکی؟'' فرمایا'' ہاں مجھ سے اس کا ذکر آیا تھا۔ باقی جو حالات ہیں سب کو معلوم ہیں۔

اس اثنا میں شفیع بھی آ گئے تھے۔ حضرت علامہ کی باتیں سنتے اور ان کے پاؤں دابتے رہے۔ علی بخش کھانا لے آیا۔ حضرت علامہ نے کھانا تناول فرمایا اور حقے کے ایک دوکش لے کر فرمایا'' والد محترم اور شاہ صاحب ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔'' اس پر مجھے خیال آیا کیوں نہ حضرت علامہ سے اپنے والد بزرگوار اور شاہ صاحب کے تعلقات کے بارے میں سوال کروں۔ مگر پھر یہ دیکھ کر کہ اس موقع پر یہ سوال نامناسب ہوگا خاموش ہوگیا۔ حضرت علامہ کہہ رہے تھے'' ایک رات میرے والد نے خواب میں دیکھا ایک سفید کبوتر بہت اونچا اُڑ رہا ہے اور پھر اُڑتے اُڑتے دفعتہً ان کی جھولی میں آ گرا۔ وہ خواب میری پیدائش سے کچھ دن پہلے کا ہے۔ وہ اسے اشارۂ غیبی سمجھے۔''

اس اشارۂ غیبی کے متعلق تو اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خاموشی مگر بڑی دلچسپی سے ان کے ارشادات سن رہے تھے۔ حضرت علامہ نے بات ختم کی تو آرام سے لیٹ گئے تاکہ تھوڑی دیر سولیں۔ میں نے شفیع سے کہا'' گھر ہو آؤں۔ واپسی میں دیر نہیں ہوگی۔''

سہ پہر ہو رہی تھی۔ واپس آیا تو حضرت علامہ ہشاش بشاش حقے کے کش لے رہے تھے۔علی بخش اور شفیع خدمت کے لیے حاضر تھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔علی بخش آیا۔حضرت علامہ نے کوئی طبّی مرکب استعمال کیا۔ پھر شفیع تو کسی کام سے چلے گئے۔ میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں افسوس کرر ہا تھا کہ سیالکوٹ میں جو مجبوراً رکنا پڑا تو اس گفتگو میں شریک نہ ہوسکا جو علامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو سے فرمائی تھی۔ میں نے مختلف بیانات سنے تھے۔ موقع پا کر عرض کیا ''پنڈت جی سے ملاقات کیسی رہی؟''

فرمایا ''ایک روز ڈاکٹر چکرورتی آئے تھے۔ کہنے لگے پنڈت جی سے جب کبھی ذکر آیا انھوں نے آپ سے بری عقیدت کا اظہار کیا۔ وہ آج لاہور آرہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے ان کی آپ سے ملاقات ہوجائے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ آپ کو جب موقع ملے انھیں یہاں لے آیئے۔ لیکن دو مسئلے ہیں: ایک ہندوستان کی آزادی، دوسرا آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ۔ پنڈت جی ان دونوں مسئلوں پر غور کرکے آئیں۔''

ارشاد ہوا ''ڈاکٹر صاحب اس روز شام کو پھر آئے۔ کہنے لگے پنڈت جی کو آج فرصت ہے، ہم لوگ آٹھ بجے حاضر ہوجائیں گے۔ میں نے کہا بسر وچشم تشریف لایئے۔ کہنے لگے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوگی۔ یہ وقت شاید آپ کے سونے کا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا آج ہم ذرا دیر سے سولیں گے، آپ حضرات آئیں تو سہی۔ چنانچہ آٹھ بجے کے قریب پنڈت جی تشریف لائے۔ ڈاکٹر چکرورتی ان کے ساتھ تھے، دو ایک خواتین اور میاں اور بیگم افتخار الدین بھی دیر تک گفتگو رہی۔''

میں نے کہا ''کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟''

فرمایا ''نہیں۔ بس یہی سیاست حاضرہ پر تبصرہ ہوتا رہا اور وہ بھی سرسری طور پر۔ کوئی خاص مسئلہ زیرِ بحث نہیں تھا، اِلّا یہ کہ روس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی میں سیاست کا جو رنگ ہے اس کا ذکر آیا تو سوال پیدا ہوا کہ مغرب کی ہوس استعمار اور جوع الارض کا نتیجہ دنیا کے حق میں کیا ہوگا، بالخصوص ایشیا کے۔ آزادی، یا غلامی، اور زیادہ غلامی! یوں باتوں باتوں میں پنڈت جی کہنے لگے، اگر مسلمان بلاقید شرائط کانگریس کا ساتھ دیں تو کیا اچھا ہو۔ آزادی کی منزل جلد

ہندوستان سے دور ہے، بہت دور۔ جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ جاپان کی نگاہیں آسٹریلیا پر ہیں۔ لہٰذا جیسے جیسے ہم اندرونی طور پر آزاد ہوتے گئے اور ہم نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کردیں انگریز خود ہی اس ملک سے نکل جائیں گے۔[۶۱] انگریز گئے تو ہم ایک دستور ساز 'اسمبلی' طلب کریں گے اور یہ دستور ساز 'اسمبلی' ایک اشتراکی آئین نافذ کردے گی۔"[۶۲]

فرمایا "یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کا نمائندہ ہے اور جس کی زبان سے شب و روز شہنشاہیت دشمنی کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ کیسا آسان تھا۔ کیسے کیسے مسلمات ہیں جن کا اس سلسلے میں مان لینا ضروری ہے۔ یہ مسلمہ کہ جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ یہ مسلمہ کہ امریکہ کو ہندوستان کی ضرورت نہیں، امریکہ ہندوستان سے دور ہے، بہت دور۔ یہ مسلمہ کہ یورپ کی کوئی قوم ہندوستان کا رُخ نہیں کرے گی۔ یہ مسلمہ کہ جیسے جیسے اندرونی آزادی حاصل ہوتی گئی انگریز ہندوستان سے تنگ آجائیں گے۔ یہ مسلمہ کہ انگریز ہندوستان سے نکل گئے تو ایک دستور ساز اسمبلی طلب کی جائے گی اور یہ اسمبلی ایک اشتراکی آئین نافذ کردے گی۔ لیکن کب؟ یہ نہ پوچھیے۔ بس اس توقع پر بیٹھے رہیے کہ یہ دن آئے گا اور ضرور آئے گا۔ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے اور ضرور چلے جائیں گے۔ ہندوستان میں ایک اشتراکی حکومت قائم ہوجائے گی۔ اسے کہتے ہیں فریب نفس۔ اسے کہتے ہیں انگریزی محاورے میں 'جنت الحمقا'۔"

فرمایا "پنڈت جی کی منطق بھی وہی ہے جو گاندھی جی کی۔ دونوں کی نظر انتقال اختیارات پر ہے۔ دونوں کے نزدیک آزادی کا مطلب ہے اندرونی آزادی۔ دونوں کا خیال ہے کہ برطانوی فوجیں اگر ہندوستان میں پڑی ہیں تو پڑی رہیں۔ اس سے ملک کی آزادی میں فرق آتا ہے، نہ ان کی شہنشاہیت دشمنی میں۔"

فرمایا "دراصل کانگریس اور حکومت کی ساری لڑائی دو بنیوں کی لڑائی ہے۔ کانگریس اسے ایک بات سمجھانا چاہتی ہے جسے وہ سمجھتی تو ہے لیکن مانتی نہیں۔ مان سکتی ہے اور مانے گی، مگر بتدریج۔ اس لیے کہ حاکم آخر حاکم ہے اور محکوم محکوم۔ کانگریس چاہتی ہے اندرونی طور پر زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ رہیں انگریزی فوجیں، سو انگریزی فوجیں اگر ہندوستان میں رہ بھی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ یوں ہندوستان کی حفاظت ہی ہوتی رہے گی۔"

فرمایا ''سارا جھگڑا اسی سودے بازی کا ہے۔ مگر ہیں دونوں بنیے۔ سودا ہو تو کیسے؟ دونوں چاہتے ہیں سودا ہو جائے، مگر ہر ایک کی کوشش ہے کہ ہاتھ اُوپر رہے۔''[٦٣]

فرمایا ''میں نے تو پنڈت جی سے صاف کہ دیا تھا مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں ہندوستان کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اسے خطرہ ہی خطرہ ہے۔[٦٤] کے نزدیک ہندوستان کچھ واقع ہی اس طرح ہے کہ ہمارے لیے چین ہی چین ہے۔[٦٥] ہم پر حملہ نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک ہوگا اور ضرور ہوگا۔[٦٦] انگریز ہندوستان سے نہیں جائیں گے۔ گئے بھی تو ایک زبردست جدوجہد کے بعد۔''[٦٧]

فرمایا ''میں نے تو ان سے یہ بھی کہ دیا تھا کہ بالفرض ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں آپ کے سب مسلمات درست ہیں۔ لیکن یہ مسلمات درست ہیں تو ان کا اور بھی تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات مان لیے جائیں اور کانگریس ان سے مفاہمت کر لے۔ ہندوستان میں کوئی تحریک کامیابی سے چل سکتی ہے تو جب ہی کہ اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد ہو اور تصفیۂ حقوق کا مسئلہ طے ہو جائے۔[٦٨] لیکن پنڈت جی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔''

میں نے کہا ''تعجب ہے پنڈت جی آپ سے ملنے آئیں، آپ سے گفتگو کریں، سوال آزادی کا ہو اور وہ آپ کی بات کا جواب نہ دیں۔''

ارشاد ہوا ''پنڈت جی اس زعم میں ہیں کہ حکومت اور کانگریس میں چوں کہ آخر کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا، لہٰذا مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے عرض کیا ''پنڈت جی اگر ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ بہر حال ان کا انداز بڑا یاس انگیز ہے۔ انھیں چاہیے تھا اپنے موقف کے حق میں کچھ تو کہتے۔ ان کا خیال شاید یہ ہے کہ بہت ممکن ہے بے اعتنائی کی اس روش سے رفتہ رفتہ مسلمانوں کا جداگانہ قومی تشخص ختم ہو جائے۔''

ارشاد ہوا ''بات تو کچھ یہی ہے۔ میں نے جب بھی انھیں سمجھانے کی کوشش کی، جب بھی کہا پنڈت جی کوئی بھی نقطۂ نظر ہو، کانگریس یا لیگ کا، تقاضائے سیاست بہر حال یہی ہے کہ اس ملک کے باشندوں کو باہم اعتماد ہو، انھوں نے ہر بار گفتگو کا رُخ بدلا اور سارا زور اسی ایک بات پر دیا کہ مفاہمت و مصالحت کا خیال غلط ہے۔ ہمیں چاہیے بغیر یہ سوال اُٹھائے مل کر کام کریں۔''

ارشاد ہوا ''میں نے تو پنڈت جی سے یہ بھی کہ دیا تھا کہ مجھے نہ کانگریس سے دشمنی ہے،

نہ بلاوجہ لیگ سے اُنس۔ میں کسی فریق کی طرف داری نہیں کر رہا۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ مفاہمت و مصالحت کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مفاہمت و مصالحت ہو کر رہے گی۔ یہ تقاضا ہے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا۔''

ارشاد ہوا ''میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یونہی نہیں کہہ رہا۔ میں وہی بات کہتا ہوں جسے حق سمجھتا ہوں۔ سنیے پنڈت جی! مسلمانوں کو انگریزوں سے کوئی عشق نہیں۔ وہ ان کے اقتدار سے کچھ زیادہ ہی نالاں ہیں اور اس کے وجوہ شاید آپ بھی سمجھتے ہیں۔[69] رہی شہنشاہیت دشمنی، سو اگر آپ دلوں کو ٹٹول سکتے ہیں تو ٹٹول لیجیے۔ شہنشاہیت دشمنی میں بھی مسلمان ہندوؤں سے کچھ آگے ہی ہوں گے۔''[70]

ارشاد ہوا ''لیکن اس کے باوجود پنڈت جی کی یہی کوشش رہی کہ اصل مسئلے سے گریز کریں۔ اس پر میں نے کہا، اچھا پنڈت جی! ایک لطیفہ سنیے۔ پہلی گول میز کانفرنس[71] منعقد ہوئی اور اس کی کارروائیوں کی روداد اخباروں میں آنے لگی تو ایک روز کچھ مسلمان میرے پاس آئے اور کہنے لگے، ہم آپ سے ایک بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، کیا؟ کہنے لگے، یہ درجۂ نو آبادیات کیا چیز ہے؟ میں نے کہا، یہ ایک قانونی اصطلاح ہے جس کے سمجھنے اور سمجھانے میں وقت لگے گا۔ کہنے لگے، اچھا اتنا بتا دیجیے کہ درجۂ نو آبادیات مل گیا تو کیا ہم آزاد ہو جائیں گے؟ میں نے کہا، نہیں۔[72] کہنے لگے، تو پھر اس سے فائدہ؟ آپ ہمارے 'لیڈروں' کو سمجھا دیجیے بے کار جلسے نہ کریں۔ یہ لوگ نہ خود سوتے ہیں نہ ہمیں سونے دیتے ہیں۔''[73]

ارشاد ہوا ''اس پر میاں افتخار الدین کہنے لگے، بات ہے بھی یہی جو آپ کہتے ہیں۔ مسلمان بھی آزادیِ وطن کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے ہندو۔ وہ بھی شہنشاہیت کے ایسے ہی دشمن ہیں جیسے کوئی اور۔ آپ حق بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ مسلمانوں پر آپ ہی کا اثر ہے۔ جناح کی کون سنتا ہے؟[74]

''میں نے کہا، مجھے یہ کہنے میں کیا عذر ہے؟[75] لیکن مشکل یہ ہے کہ جناح تو حق بات سن لیتے ہیں۔ نہیں سنتی تو کانگریس۔ کیا کانگریس فی الواقع آزادی کی خواہاں ہے؟ انھیں معنوں میں جن میں مسلمان؟ کیا ہندو سچ مچ شہنشاہیت کے دشمن ہیں، جیسے مسلمان؟''[76]

فرمایا ''میں نے کہا، میاں صاحب! اس اَمر سے تو شاید آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ

مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ کوئی بھی جماعت ہو اس میں باہم اتحاد ہونا چاہیے۔ کیا یہ کوئی دل پسند بات ہے کہ مسلمانوں کا تفرقہ وانتشار قائم رہے۔ پھر جب اتحاد ایک اَمر ضروری ہے اور جناح کی قیادت سے تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہو گیا ہے تو اسے کیا اس لیے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے مسلمان بحیثیت ایک قوم متحد ہو جائیں۔ معاف کیجیے میں اس کے لیے تیار نہیں۔ اس اتحاد کو کانگریس کی رضا جوئی، یا ہندوؤں کی خوشنودی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔"

فرمایا "میاں صاحب نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ چند منٹ اور نشست رہی، پھر یہ حضرات تشریف لے گئے۔"

شفیع آ گئے۔ شاید بچوں کی دیکھ بھال کر رہے یا کسی اور کام میں مصروف تھے۔ علی بخش چائے لے آیا، دوا کا پوچھا۔ حضرت علامہ کب سے گفتگو کر رہے تھے، اگرچہ رُک رُک کر اور بیچ میں ستا بھی لیتے۔ انھوں نے چائے پی تو علی بخش حسبِ معمول شانے اور پاؤں دابنے لگا۔ اسی اثنا میں رحما بھی آ گیا۔ وہ بھی پائنتی کی طرف ہو بیٹھا۔ چودھری صاحب کا انتظار تھا۔ شفیع کوئی بات کہہ رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ بظاہر پنڈت جی اور حضرت علامہ کی یہ ملاقات کیسی پرتپاک رہی، لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ اِلّا یہ کہ ڈاکٹر چکرورتی کا خیال پورا ہو گیا۔ یا یہ کہ پنڈت جی کی سیاست فہمی، وسعت دلی اور رواداری کے بارے میں جو حسن ظن چلا آ رہا تھا ختم ہو گیا۔[۷]

شام ہو رہی تھی میاں بشیر احمد[۸] آ گئے۔ حضرت علامہ کا مزاج پوچھا اور بات چیت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا "میں نے سنا ہے آپ نے پنڈت جی سے فرمایا تھا کہ پنڈت جی بات اصل میں یہ ہے کہ آپ تو محبِّ وطن ہیں لیکن جناح قانون دان، یا شاید یہ کہ جناح سیاست دان ہیں، آپ محبِّ وطن۔ انھوں نے کہا یہ بات ویسے تو ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اندیشہ ہے لوگوں میں اس کا چرچا ہوا تو مخالفین اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ ہماری کوئی صحافت نہیں ہے، نہ کوئی مرکز اطلاعات اور نشر واشاعت۔ یوں لیگ اور جناح کے خلاف غلط پراپیگنڈا ہو گا"

حضرت علامہ نے فرمایا "فرض کیجیے میرے الفاظ کا وہی مطلب ہے جو بقول آپ کے، لوگوں نے سمجھا۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کہی تھی اور وہ یہ

کہ جناح سیاست دان ہیں، لیکن پنڈت جی محبّ وطن۔[۷۹] اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جناح میں حب الوطنی کی کمی ہے یا یہ کہ پنڈت نہرو بہت بڑے سیاست دان ہیں۔ میرا کہنا تو یہ تھا کہ پنڈت نہرو کی نظر حقائق پر نہیں جیسا کہ ایک سیاست دان کی ہونی چاہیے۔ وہ جذبات کی رَو میں بہ رہے ہیں، گو بسبب جذبۂ حب الوطنی۔ لیکن یہ اَمر سیاست کے منافی ہے۔ برعکس اس کے جناح سیاست دان ہیں، ان کا مزاج قانونی ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں ہندوستان کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ بھی کہ ہندوؤں اور انگریزوں میں جو کش مکش جاری ہے اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کر رہے کہ حب الوطنی کے جوش میں واقعات سے آنکھیں بند کر لیں۔[۸۰] وہی تو حقیقت میں محبّ الوطن ہیں۔''

میاں صاحب نے حضرت علامہ کے ارشادات سنے تو ان کا اطمینان ہو گیا، لیکن اب سوال یہ تھا کہ حضرت علامہ کے اس قول کی جو غلط تعبیر کی جا رہی ہے اگر اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔ ظاہر ہے اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اگر تھی تو یہ کہ مسلمان متحد ہوں، جناح کے ہاتھ مضبوط کریں اور ان کی قیادت سے فائدہ اُٹھائیں اور یہی حضرت علامہ کا ارشاد بھی تھا۔

میاں صاحب نے کہا ''کچھ یہی مشکلات ہیں جن کے پیشِ نظر ایک خیال ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟''

حضرت علامہ نے فرمایا ''کیا خیال ہے؟ کہیے۔''

میاں صاحب کہنے لگے، ''خیال یہ ہے کہ لیگ کا اجتماع لاہور میں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اجتماع کیسے ہوگا؟ مجھے ڈر ہے اگر ایسا ہوا تو یونینسٹ پارٹی لیگ سے الگ ہو جائے گی، اجتماع ناکام رہے گا۔''[۸۱]

ارشاد ہوا ''میری تو شروع ہی سے رائے تھی کہ اس پارٹی کو لیگ میں شامل نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ شمولیت پر اصرار بھی کرے تو اس کی درخواست ٹھکرا دی جائے۔[۸۲] رہا اجتماع، سو میاں صاحب آپ گھبراتے کیوں ہیں؟ ہمت کیجیے۔ آپ نے ہمت سے کام لیا تو مسلمان آپ ہی کے ساتھ ہوں گے۔''[۸۳]

مکرر آنکہ

میں نے پنڈت نہرو کی اس ملاقات کو صرف حضرت علامہ کے ارشادات تک محدود رکھا ہے، یعنی اس گفتگو تک جو انھوں نے خود مجھ سے فرمائی۔ ویسے اس ملاقات کا حال میاں شفیع (م-ش) کو بھی معلوم ہے۔ علاوہ ازیں حضرت علامہ نے چودھری صاحب سے بھی فرمایا تھا کہ ۱۹۰۶ء سے لے کر تا ایں دم (۱۹۳۸) میں نے ہندو مسلم تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جی کو ایک ایک واقعہ کے پیشِ نظر سمجھا دیا تھا کہ انھیں مصالحت سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ضروری ہے۔

ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے بھی اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال میں اس ملاقات کی جزوی روداد راجا حسن اختر مرحوم کے حوالے سے قلم بند کی ہے اور لکھا ہے کہ اس ملاقات کے دوران میں میاں فیروز الدین احمد مرحوم اور راجا حسن اختر مرحوم بھی جاوید منزل میں موجود تھے۔ حضرت علامہ سے اگرچہ میں نے یہ دریافت تو نہیں کیا کہ علاوہ ان حضرات کے جو پنڈت نہرو کے ساتھ جاوید منزل آئے اور کون لوگ شریک گفتگو تھے، لیکن میرا قیاس ہے کہ چودھری صاحب اور راجا صاحب، جیسا کہ معمول تھا، سرِشام جاوید منزل آئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے پنڈت جی کے آنے تک وہیں ٹھہرے رہے ہوں۔ م-ش کا تو خیر قیام ہی جاوید منزل میں تھا۔ وہ کہاں تک شریک گفتگو ہوئے، مجھے معلوم نہیں۔ چودھری صاحب یقیناً پہلے تشریف لائے ہوں گے، راجا صاحب بعد میں اور پھر قرشی صاحب بھی۔ لیکن ان حضرات میں سے کوئی بھی تو شریک گفتگو نہیں ہوا ورنہ ضرور تھا کہ حضرت علامہ مجھ سے ان کا ذکر کرتے۔ میاں فیروز الدین احمد کا آنا تو قطعاً قرین قیاس نہیں۔

بہرحال اس گفتگو کے سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں اور دونوں اپنی جگہ پر بڑی اہم۔ ایک تو یہ کہ حضرت علامہ نے جب پنڈت نہرو سے پوچھا کہ جہاں تک اشتراکی نظام زندگی کا تعلق ہے کانگریس میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد کتنی ہے تو انھوں نے کہا تقریباً نصف درجن۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں (عاشق بٹالوی: اقبال کے آخری دو سال، صفحہ ۵۴۸، ۵۴۹)، لیکن حضرت علامہ نے باوجود تفصیل کے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یوں بھی میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

دوسری اہم بات ہے اس ملاقات کے بارے میں خود پنڈت جی کے 'انکشاف ہند' میں

اپنے ارشادات۔ ان کا بیان ہے: ''ڈاکٹر صاحب نے مجھے یاد فرمایا (حالانکہ اس ملاقات کی تحریک ڈاکٹر چکرورتی نے کی تھی)...... ہمارے درمیان کس قدر اشتراک تھا...... میں نے محسوس کیا ان کے ساتھ مل کر کام کرنا کیسا سہل ہے...... پرانی یادیں تازہ ہو گئیں...... میں ان کی شاعری کا مداح ہوں...... میں زیادہ تر انھیں کی باتیں سنتا رہا۔ میں خوش تھا کہ وہ مجھے پسند فرماتے ہیں، میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔''

109

مگر پھر یہ سب کچھ کہنے کے بعد آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال تقسیم ہند، یعنی پاکستان کے نظریے کو ناپسند فرماتے تھے حالانکہ پنڈت جی کی یہ رائے ایڈورڈ ٹامسن[۸۴] کے اس بیان پر مبنی ہے جو سرتاسر غلط اور جعلی ثابت ہو چکا ہے۔[۸۵]

نیز دیکھیے استدراک، کتاب کے آخر میں۔

حواشی

۱- حکیم نابینا مرحوم و مغفور۔

۲- وطن لاہور، ۲۲-۱۹۲۱ء تک اسلامیہ کالج لاہور میں استاذ کیمیا۔ پھر جرمنی چلے گئے اور فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے تو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن میں شعبۂ کیمیا کے صدر مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت مغربی پنجاب کے ماتحت ڈائرکٹر انڈسٹریز کا عہدہ سنبھالا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں بعارضہ قلب انتقال ہو گیا۔ راقم الحروف کو اسلامیہ کالج کے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان سے نیاز حاصل تھا۔ جب بھی ملتے بڑی شفقت فرماتے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۳- ان دنوں پروفیسر کے-ای- میڈیکل کالج لاہور۔ دیکھیے اشاریہ۔

۴- وطن ارکونم- بڑے اقبالی اور دردمند نوجوان- اقبالیات کے سلسلے میں اکثر مجھ سے خط و کتابت کرتے۔ اُردو 'اقبال نمبر' میں ان کا ایک مضمون موجود ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تقسیم ملک کے بعد کہاں ہیں۔ ارکونم ہی میں مقیم یا نقل مکانی کر چکے ہیں۔

۵- پنڈت پیارے کشن۔ لاہور اور لاہور سے باہر پھیلے ہوئے کشمیری پنڈتوں کے اس مشہور خاندان کے چشم و چراغ

تعلیم ہے۔

۱۱- جس میں انسان اپنی انفرادیت اور تشخص کھو بیٹھتا ہے جیسے ڈاکٹر جیکال (Jekyll) اور مسٹر ہائیڈ (Hyde) کی مثال دی جاتی ہے۔

۱۲- کہ سنسار چکر لازم آئے اور اس لیے خودی کا نسخ ایک سے دوسری خودی میں ہوتا رہا۔ یا نیٹشے کی طرح یہ کہا جائے کہ ہر شے واپس لوٹ آتی ہے اس لیے کہ زمانے کی حرکت دوری ہے۔ اس کے مراکز توانائی کا برابر اعادہ ہوتا رہے گا۔ لیکن اس عقیدے میں پھر ایک خوبی ہے اور وہ ہر شے کی بار بار رجعت، لہٰذا فوق البشر کا ظہور کیوں کہ اس کا ایک مرتبہ ظہور ہو چکا ہے۔

۱۳- قرآن مجید میں ہے کفار کہیں گے 'لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً' ۲(البقرہ): ۱۶۷ یعنی ہمیں پھر دنیا میں واپس جانا مل جائے۔ ارشاد ہوتا ہے یہ ممکن نہیں۔ حضرت علامہ نے رجع کا لفظ کرہ ہی کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ رجع کے معنی بھی یہی کسی گزری ہوئی حالت کی طرف رجوع کے ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں جب حیات بعد الموت پر زور دیا جاتا تو کافر کہتے یہ پھر زندگی کی طرف رجوع کیسے ممکن ہے (ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ-ق:۳)۔ جواب ملتا یہ رجع نہیں ہے، یہ خلق جدید ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی تو خلق ہو چکے ہیں یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی (اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ-ق:۱۵)۔ گویا جس طرح انسان کی ایک نشاۃ اولیٰ ہے۔ ایسے ہی ایک نشاۃ آخری۔ یہ سارا معاملہ یعنی 'نشاۃ' ایک حیاتی عمل کا ہے، نسخ کا نہیں ہے۔

اصطلاحاً رجع کا اطلاق ملاحدہ کے اس عقیدے پر بھی ہوتا ہے کہ کسی انسان کا بعد از مرگ آسمان سے بجسد عنصری دنیا میں پھر نزول ہو۔

۱۴- (الملک:۲)۔

۱۵- حیات دنیوی اور اخروی دونوں میں اور جو نتیجہ ہے ہدایت کا (۲:۳) تاکہ ان قوتوں کا ازالہ ہو سکے جو خودی کی تربیت اور حفظ و استحکام میں مانع ہیں۔ برعکس اس کے وہ قوتیں کارفرما ہیں جن سے ان کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے۔ دونوں کے مواقع برابر برابر ہیں۔ "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا o قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا o" (الشمس:۸-۱۰)۔

پھر ایک اور امر قابلِ غور یہ ہے کہ بعثت ثانیہ سے مقصود ہے اعمال کی جواب دہی (۲:۲۸۴) اور اس کا تقاضا یہ کہ انسان ایمان اور عمل صالح کی بدولت اپنے آپ کو 'اجر غیر ممنون' کے لیے تیار کرے (التین:۵۰) گویا زندگی ایک تیاری ہے اور اس کا مسئلہ مستقبل کی تیاری، نہ کہ سنسار چکر سے استخلاص......مکتی۔

۱۶- اور یوں نفی میں اثبات کی ایک صورت پیدا ہوگی۔ اگر چہ محض کہنے کو۔

۱۷- اصطلاحاً مکتی۔ سنسار چکر سے استخلاص اور جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی طرح مادی دنیا بھی شر ہے۔ بالفاظِ دیگر عمل تخلیق فریب (مایا)، ہے یا شر۔ بلکہ فریب اور شر دونوں۔

۱۸- لہٰذا ہندو عقیدہ ’کرم‘ لیکن جس سے کرم (عمل) میں کوئی قدر و قیمت پیدا نہیں ہوتی۔

۱۹- وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (نوح:۱۴)۔

۲۰- لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق:۱۹)۔ نیز دیکھیے اس سلسلے میں خطبات، خطبۂ اول۔

۲۱- بجوائے آیۂ شریفہ ۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ......

۲۲- اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (المومنون:۱۱۵)۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (القیامۃ:۳۶)

۲۳- الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (اعلیٰ:۲-۳)۔

۲۴- كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرہ:۲۸) ایک ہی خودی کی ایک حالت سے دوسری میں تبدیلی۔

۲۵- والدہ مرحوم کی یاد میں:

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

۲۶- جن سے خودی میں ضعف و اضمحلال اور زوال و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ (۱۰:۹۱)

۲۷- زبور عجم

۲۸- کرم کا پھل۔

۲۹- منکرین حیات بعد الموت کے اس قول کے جواب میں ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (ق:۲)۔

۳۰- قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (ق:۴)۔

۳۱- قرآن پاک کی رُو سے ایک تو ہماری نشاۃ الاولی ہے، یعنی زندگی کی وہ منزل جس سے ہمارا گزر ہو رہا ہے اور جس میں روح اور مادہ یا جسم و جان کی ظاہری ثنویت کے باوجود ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ خودی ایک وحدت ہے۔ لہٰذا یہ راز کہ نشاۃ الاخری سے پہلے جب موت کے ہاتھوں جسم کی بربادی بظاہر خودی کی بربادی ہے تو وہ حیاتی عمل کیا ہے جو اندریں صورت سرزد ہوگا۔ ضائع ہوگا تو کیا، نہیں ضائع ہوگا تو کیا؟

۳۲- شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے۔ نسمہ کے معنی ہیں نہایت لطیف جسم، جسم برائے نام۔ اسے مطیۃ الروح (روح کا مرکب) بھی کہا گیا ہے اور وہ روح کا مترادف بھی ہے۔

خودی کا تجربہ ہمیں بطور ایک مرکز محسوسات و مدرکات ہی کے ہوتا ہے، وہ ایک نقطۂ شعور ہے لیکن اس کا ایک مادی حوالہ بھی ہے، یعنی جسم۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات بعد الموت پر بھی کیا کسی مادی

ی طرح سس جدید کا ایک سل جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ دیکھیے سورۂ ق: آیات ۴-۵۔

۵۰- یہ اشعار بالِ جبریل میں شائع ہو چکے ہیں بعنوان 'سر اکبر حیدری کے نام'۔ شاید یہی نظم تھی جس کے پیشِ نظر حضرت علامہ کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد 'شاد اقبال خط و کتابت' کے نام سے ایک مجموعہ مکتوبات شائع ہوا۔ لیکن ان خطوں میں تو کوئی ایسی بات نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت علامہ مہاراجا صاحب سے کسی عنایت کے خواستگار تھے۔

۵۱- Under my control

۵۲- مولانا روم کا ارشاد ہے:

اہلِ دنیا کافران مطلق اند	ہر دم اندر زق زق اندو بق بق اند
اہلِ دنیا چہ کہین و چہ مہین	لعنۃ اللہ علیہم اجمعین

۵۳- حضرت علامہ نے job sniffers کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ملازمتوں کی بو سونگھنے والے۔

۵۴- ۱۸۴۸ء میں جب سکھوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

۵۵- جہاں ایک صوفی منش بزرگ، عالم دین اور سالک و عارف مولانا غلام حسین علیہ الرحمۃ درس دیتے تھے۔

۵۶- شمس العلما مولانا مولوی میر حسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ کے استاد محترم۔

۵۷- جیسے ۱۹۲۲ء میں ہوا کہ چوری چورا (گجرات دیس) میں عدم ادائے مالیہ کی مہم نے فتنہ و فساد کی شکل اختیار کر لی۔ لہٰذا بارددلی کا فیصلہ کہ تحریکِ ترکِ موالات بند کر دی جائے۔

۵۸- اور ہندو اکثریت کو بتدریج اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں پر تغلب اور برتری حاصل رہے گی۔

۵۹- جس میں کانگریس کو فائدہ ہی فائدہ نظر آتا تھا۔ اس لیے کہ برطانوی فوجوں کی موجودگی میں نہ تو بدامنی کا خطرہ تھا، نہ خانہ جنگی کا۔ حکومت بھی مجبور ہو گی کہ اور نہیں تو محض اپنے مفاد کے پیشِ نظر فتنہ و فساد نہ پھیلنے دے، جو ظاہر ہے اکثریت اور اقلیت میں عدم اعتماد کی صورت میں ضرور پھیلتا۔ جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔

۶۰- یعنی اس وقت جب ہندوؤں اور انگریزوں میں مستقلاً کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا اور کانگریس سمجھے کہ ملک اندرونی اور بیرونی دونوں پہلوؤں سے محفوظ ہے اور اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔

۶۱- اس لیے کہ بالآخر ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔

۶۲- یہ اشتراکی آئین کا نفاذ بھی محض ایک سیاسی حیلہ تھا جیسا کہ حصول آزادی پر ثابت ہو گیا۔ پنڈت جی ۱۹۶۲ء تک برسرِ اقتدار رہے مگر سرمایہ داری کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا۔

۶۳- جیسا کہ الٰہ آباد میں حضرت علامہ اشارہ کر چکے تھے کہ انگلستان کے پنڈت اور ہندوستان کے پنڈت باہم کچھ سوچ رہے ہیں (دیکھیے خطبۂ صدارت)۔

۶۴- جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں ثابت ہوگیا اور جیسا کہ بھارتی حکمرانوں کے نزدیک اب بھی ہے۔

۶۵- حضرت علامہ کے الفاظ تھے: "That we are smugly situated"

۶۶- جیسا کہ ۱۹۴۲ء میں فی الواقع ہوا۔ جاپانی فوجیں برما سے ہوکر آسام میں داخل ہوگئیں اور پھر اب تو یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ امریکہ کو ہندوستان کی ضرورت ہے۔

۶۷- گو یہ جدوجہد یورپ میں ہوئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کو چھوڑا تو ان حالات کے زیر اثر جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بین الاقوامی دنیا میں رونما ہوئے اور وہ بھی مزدورِ حکومت کے اقتدار کی بدولت ورنہ قدامت پسند فریق تو جب بھی اس پر آمادہ نہیں تھا۔ دیکھیے اس سلسلے میں مسٹر چرچل کی برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر جس مین ۱۹۴۷ء کی ہولناک جانی اور مالی تباہی کے بارے میں ان کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

۶۸- جسے کانگریس نے بڑی چالاکی سے فرقہ داری communalism کا نام دے رکھا تھا تاکہ دنیا یہ سمجھے مسلمانوں میں کوئی سیاسی سوجھ بوجھ ہے، نہ آزادی کی طلب۔

۶۹- اس لیے کہ پنڈت جی نے تاریخ عالم پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ عالمِ اسلام کو جو بھی نقصان پہنچا انگریزوں سے پہنچا۔ ہندوستان میں بھی ۱۸۵۷ء تک جو کچھ ہوا اور مسلمانوں کو سیاسی، اخلاقی اور معاشی اعتبار سے جس طرح کچلنے کی کوشش کی گئی پنڈت نہرو اس سے بے خبر نہیں تھے۔

۷۰- بسبب احوال عالم اور بسبب اپنی افتادِ طبیعت کے اسلام کے زیر اثر۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا مطلب تھا برطانوی اقتدار سے آزادی، ہندوستان ہی کی نہیں، سارے ایشیا اور عالمِ اسلام کا مکمل استخلاص۔

۷۱- ۱۹۳۰ء میں۔

۷۲- گو باوجود کامل آزادی اور شہنشاہیت دشمنی کی رٹ کے کانگریس کا عین مقصد یہی تھا کہ برطانوی حکومت سے سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم رہیں اور وہ ہندوستان کی حفاظت بھی کرتی رہے۔ البتہ اندرونی طور پر سارا اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آجائے۔ چنانچہ ہندوؤں کی اس ذہنیت کے پیشِ نظر حضرت علامہ نے میر رضی دانش کے اس شعر

نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند ۔۔۔ بہ نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

کی تضمین کرتے ہوئے 'درجۂ نو آبادیات' کے عنوان سے چند اشعار کا ایک قطعہ بھی لکھا تھا (دیکھیے آخر میں ضمیمہ)۔

۷۳- یہ جلسے درجۂ نو آبادیات کی مخالفت اور موافقت میں رات کے ایک ایک دو دو بجے تک قائم رہتے۔

۷۴- میاں صاحب مرحوم اس وقت بڑے کٹر کانگریسی تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بات کہی تاکہ حضرت علامہ

جمعۃ المبارک: ۲۸ رجنوری

دو دن بخار کی نذر ہوگئے۔ طبیعت اگرچہ ٹھیک نہیں تھی، لیکن ریڈیو اسٹیشن گیا تو واپسی میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یوں بھی دو روز کے ناغے سے پریشان تھا۔ خیال حضرت علامہ ہی کی طرف تھا۔ پھر ابھی صبح ہی تھی کہ علی بخش آ گیا، کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب یاد کررہے ہیں، فرماتے ہیں غیر حاضری کی وجہ کیا ہے؟ میں نے کہا، علی بخش، مجھے بخار آ گیا تھا۔

دس بجے تھے کہ جاوید منزل پہنچا۔ حضرت علامہ منشی خانے سے باہر برآمدے میں آرام فرمارہے تھے۔ دھوپ مزے کی تھی۔ میں نے سلام عرض کیا، مزاج پوچھا اور غیر حاضری کی معذرت کی۔

فرمایا ''اب طبیعت کیسی ہے؟ شہر کا کیا حال ہے؟ سنا ہے لوگوں میں بڑا جوش وخروش ہے۔ کل ہڑتال بھی رہی۔''

میں نے کہا ''مسلمان فی الواقع بڑے برافروختہ ہیں۔ ہائی کورٹ سے انصاف کی توقع تھی، لیکن پوری نہ ہوئی۔''

ارشاد ہوا ''کوئی خاص بات؟''

میں نے عرض کیا ''خاص بات یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کررہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ان کا یہ رویہ سمجھ میں نہیں آتا، اس کی وجہ کیا ہے۔''[1]

ارشاد ہوا ''مولوی صاحب ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ گفتگو یہی شہید گنج کی تھی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مولوی صاحب پوچھتے تھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ قانون شکنی کی تحریک عام کردی جائے، بلکہ اس میں سارا ہندوستان شریک ہو۔ یوں مسجد تو شاید نہ ملے، لیکن یہ تو ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے ایجی ٹیشن کرنا جانتے ہیں۔''

فرمایا ''مسجد کی قربانی اگر مسلمانوں کے لیے زندگی کا وسیلہ بن جائے تو کیا برا ہے؟ ایجی ٹیشن ہوا تو ہوسکتا ہے اس سیلاب میں کچھ خس و خاشاک بھی بہ جائیں۔''[۲]

میں نے عرض کیا ''ایجی ٹیشن ہوسکے تو بہت ممکن ہے مسجد بھی مل جائے۔''

فرمایا ''کیوں نہیں۔ لیکن ضرورت بہر حال ایجی ٹیشن کی ہے۔ اس اَمر کی کہ مسلمان ایجی ٹیشن کرنا سیکھیں۔''[۳]

میرے اس استفسار پر کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، فرمایا ''ہائی کورٹ کا فیصلہ سرتاسر غلط ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں قانون سے بڑھ کر سیاسی مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔''[۴]

پھر قدرے سکوت کے بعد فرمایا ''یہ اس اَمر کی دلیل ہے کہ انگریزی حکومت کا زوال ہو چکا ہے۔ یہ صرف زوال پذیر حکومتیں ہیں جو عدل و انصاف کو چھوٹی چھوٹی مصلحتوں پر قربان کردیتی ہیں۔''[۵]

ارشاد ہوا ''صحیح فیصلہ وہی ہے جو جسٹس دین محمد کا ہے[۶] ان کی اختلافی رائے بالکل درست ہے۔ اسلامی فقہ کی رُو سے جائداد میں، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، وقف یا غیر وقف، منقولہ اور غیر منقولہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس پر کوئی حق ملکیت قائم ہوسکتا ہے، نہ قانون تحدید املاک کا اطلاق ممکن ہے۔''[۷]

پھر قدرے سکوت کے بعد فرمایا ''لیکن اس سے بھی کہیں بڑھ کر سوال یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کی بنا جس قانون پر ہے وہ اسلامی قانون اوقاف کا ناسخ تو ہے نہیں؟ برعکس اس کے اوقاف کے بارے میں صاف و صریح ضمانت موجود ہے کہ ان کا فیصلہ مسلمانوں کے شخصی قانون کے مطابق ہوگا۔''

فرمایا ''حکومت بظاہر قانون کی آڑ لے رہی ہے، لیکن قانون کے پردے میں ایک بہت بڑا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ حکومت چاہتی ہے مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کو مضبوط کرے۔ ہندوؤں کے لیے بھی کسی توڑ کی ضرورت ہے۔ سکھوں کو اُٹھانے کی ابتدا گوردوارہ بل سے ہوئی۔ افسوس ہے اسے ایک ایسے مسلمان[۸] کی تائید حاصل تھی جس نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے کہ اگر سکھ مضبوط ہو گئے تو اسلامی مفاد کو شدید نقصان پہنچے گا حکومت کا ساتھ دیا۔ بہر حال حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ قانون ہے، نہ سیاست، نہ کسی قوم کے مذہبی جذبات، نہ معابد کا احترام۔''

حضرت علامہ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ دم کشی کی تکلیف تھی۔ پھر فرمایا ''سکھ مغلوں کے دشمن تھے۔ مغل حکومت کمزور ہوئی تو اسی لاہور میں انھوں نے سال ہا سال حکومت کی۔ شاہی مسجد کی بے حرمتی کس کس طرح نہیں ہوئی۔[9] شہید گنج کے نام سے گوردوارہ بھی تعمیر کرلیا گیا، لیکن مسجد سے تعرض نہیں ہوا، حالانکہ سکھ چاہتے تو اسے منہدم کرسکتے تھے۔ لیکن اس انگریزی حکومت کو دیکھیے کہ مساجد اور معابد کے تحفظ اور احترام کی یقین دہانی کے باوجود قانون اور انصاف دونوں کا خون کررہی ہے۔''

میں خاموشی سے حضرت علامہ کے ارشادات سن رہا تھا۔ انھوں نے کچھ ستا کر پھر کہا ''یہ جو کچھ ہے حکومت کی حیلہ سازی ہے۔ حکومت کی حیلہ سازیوں کا کیا کہنا! بسمارک نے ایک جھوٹی خبر دے کر فرانس اور جرمنی میں جنگ چھیڑ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ایک جھوٹ سے جرمن قوم متحد ہوجائے تو اس میں کیا گناہ ہے۔ مگر لوگ تھے کہ اس کے محل کے ارد گرد جمع ہوجاتے اور دستور کا مطالبہ کرتے۔ بسمارک نے جب یہ دیکھا تو ایک روز تنگ آ کر کہنے لگا: احمقو! میں تمھیں سلطنت دے رہا ہوں، تم دستور دستور چلاتے ہو......''[10]

حضرت علامہ گفتگو کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ میں بھی مصلحتاً خاموش تھا۔ انھوں نے حقے کے دو ایک کش لیے، ذرا سی دیر کے لیے کروٹ بدلی، پھر تکیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا ''آج کیا خبر ہے؟''

میں نے عرض کیا ''اہلِ حبشہ کا دعویٰ ہے کہ ملک کا کچھ حصہ ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔''

فرمایا ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دول مغرب اور انجمن اقوام کی روش اس بارے میں کیا ہے؟ ان کا فیصلہ تو بہر حال اٹلی کے حق میں ہوگا۔ یہ حق قائم رہا تو ملک کے باقی حصوں پر بھی اس کا قبضہ ہوجائے گا۔[11]

میں نے کہا ''مگر لائیڈ جارج کہتا ہے مسولینی 'بلفر'[12] ہے، تنکوں کے سہارے کھیل رہا ہے۔ وہ کہتا ہے فطائیت ہو یا نا تسیت یا اشتمالیت، ان میں کوئی فرق نہیں۔''[13]

میں نے یہ بھی کہا ''لائیڈ جارج کہتا ہے دنیا کا امن فرانس اور انگلستان کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فرانس کا قلب صحیح ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں۔''[14]

ارشاد ہوا ''بشرطیکہ اشتمالیت نے اسے ماؤف نہ کردیا ہو۔''[15]

میں مصلحتاً خاموش ہوگیا۔ میرا خیال تھا حضرت علامہ کو زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کرنی چاہیے، انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ نے بھی کروٹ لی۔ تھوڑی دیر آرام فرمایا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

ارشاد ہوا ''تین شعر ہیں۔ درج بیاض کر دو:''

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است[16]

میں نے اشعار درج بیاض کیے اور دل ہی دل میں حضرت علامہ کے ارشادات کا لطف اُٹھا رہا تھا کہ علی بخش آ گیا اور کہنے لگا ''دوا کا وقت ہو گیا ہے۔''

حضرت علامہ نے دوا کھائی۔ طبّی مرکبات کی خوبی اور طبّی مرکبات کے سلسلے میں اطبا کے حسن مذاق پر تبصرہ ہونے لگا۔ باتوں باتوں میں افلاطون اور ارسطو کا ذکر آ گیا۔ میں نے پوچھا ''یہ جو ہم لوگوں میں ارسطو اور افلاطون کے طبیب ہونے کا خیال پھیل گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟''

حضرت علامہ نے فرمایا ''افلاطون تو شاید طبیب نہیں تھا۔ ارسطو ممکن ہے تھوڑا بہت مطب کرتا ہو۔[17] یوں بھی اس زمانے میں پڑھے لکھے آدمی کو طب سے کچھ واقفیت ضرور ہوتی تھی، جیسے مسلمانوں میں دستور رہا ہے۔''[18]

پھر ارشاد ہوا ''جالینوس کے کچھ نسخے ملے ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے یہ نسخے مسلمان اطبا نے اس سے منسوب کر دیے ہوں۔''

میں نے عرض کیا ''کیسے؟''

فرمایا ''ایک تو اس لیے کہ وہ زمانہ استناد، یعنی کسی بڑی شخصیت کا سہارا ڈھونڈنے کا تھا۔ یوں بھی شروع شروع میں مسلمانوں کا ذہن یونانی علم و حکمت سے دب گیا تھا، جس کے خلاف ردعمل تو ہوا، لیکن بہت آگے چل کر۔[19] پھر اس زمانے میں یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی شخص کو اپنے خیالات

کا اظہار مقصود ہوتا تو وہ کسی اعلیٰ تصنیف کی شرح لکھنا شروع کر دیتا[۲۰] تا کہ جو کچھ کہنا ہے اس کے پردے میں کہے اور یوں اسے کسی مانی ہوئی شخصیت کی پناہ بھی حاصل ہو جائے۔''[۲۱]

پھر مسکرا کر فرمایا ''لیکن آج کل حالت یہ ہے کہ لوگ دوسروں کے خیالات کو اپنا بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔''[۲۲]

حواشی

۱- دو روز پہلے ہائی کورٹ نے وہ اپیل خارج کر دی جو مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے دائر کی گئی تھی، لہٰذا شہر میں بڑا جوش پھیل گیا اور ہڑتال بھی ہوئی۔ مولانا ظفر علی خان کا رویہ یوں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ۱۹۳۵ میں جب مسجد شہید کی جا رہی تھی تو یہ مولانا ہی تھے جن کے زیرِ قیادت مسلمان حکومت کے مقابلے میں نکل کھڑے ہوئے اور نوبت کشت و خون تک جا پہنچی، گو مسجد کا انہدام رُک نہ سکا۔

۲- یعنی وہ مفاد پرست عناصر جنھوں نے اس معاملے میں حکومت کا ساتھ دیا اور بڑی بے غیرتی سے اپنے قومی وقار کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھا، بلکہ خانۂ خدا کی توہین اور انہدام تک برداشت کیا حالانکہ یہ اس برسرِ اقتدار جماعت (یونینسٹ پارٹی) کے رکن تھے جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس لیے خیال تھا کہ اگر ان کی شہ نہ ہوتی تو سکھوں کو کبھی جرأت نہ ہوتی کہ مسجد کو گرا دیں، بالخصوص جب اس سے پہلے وہ سمجھوتے پر بھی آمادہ تھے۔ دیکھیے ضمیمہ۔

۳- بغیر اس کے نہ مفاد پرست عناصر کا خاتمہ ہوتا، نہ یونینسٹ پارٹی کا زور ٹوٹتا، نہ حکومت اور کانگریس (ہندو) یہ سمجھتی کہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے لڑنا جانتے ہیں، لہٰذا ان کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔ مسلمان اس سے پہلے ایجی ٹیشن کر چکے تھے، ۱۹۲۰-۱۹۲۱ میں بسلسلۂ تحریکِ ترکِ موالات۔ لیکن یہ تحریک بظاہر ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر اُٹھائی تھی۔ آگے چل کر ہندوؤں نے الگ تھلک ایجی ٹیشن کیا اور سکھوں نے بھی۔ یہ صرف مسلمان تھے جن کے متعلق خیال تھا کہ ان کی جمعیت پراگندہ ہے اور وہ حکومت کے سہارے جی رہے ہیں، لہٰذا ان سے کیسی بھی زیادتی کی جائے چپ چاپ برداشت کر لیں گے، ایجی ٹیشن نہیں کریں گے۔
مزید برآں یہ ایک نفسیاتی لمحہ تھا جس سے فائدہ اُٹھایا جاتا تو مسلمانوں میں نئے سرے سے زندگی عود

کر آتی اور یاس و بے دلی کی وہ کیفیت بھی جو تحریکِ ترکِ موالات کی ناکامی کے باعث قوم پر طاری تھی دور ہو جاتی۔ ہندو اور سکھ تو اس تحریک کے بعد اپنی صفیں مضبوط کر چکے تھے۔ مسلمان البتہ طرح طرح کی جماعتوں میں منقسم، روز بروز انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو رہے تھے۔ مسجد کا انہدام مسلمانوں کی غیرت ملی پر ایک نہایت کڑی ضرب تھی۔ وہ اگر ایجی ٹیشن کرتے تو جس طرح مسجد کانپور کے انہدام پر ان کے جذبہ ایثار اور سرفروشی سے قوم میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی، بعینہٖ یہی کچھ ۱۹۳۸ء میں ہوتا۔ لیکن احرار خاموش تھے، قوم پرست مسلمان خاموش، یونینسٹ پارٹی نہ صرف خاموش بلکہ اس معاملے میں ایک طرح سے حکومت کی طرف دار، لیگ کم زور اور مضمحل...... کوئی نہیں تھا جو مسجد کے نام پر مسلمانوں کو ساتھ لے کر حکومت کے خلاف قدم اُٹھاتا، حالانکہ جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا کہ مسلمان ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کے مقابلے میں متحد ہو جاتے اور اپنے حقوق کے لیے ایجی ٹیشن کرتے۔

۴- یہ مصلحتیں واضح تھیں، مثلاً مسلمانوں کی غیرت ملی، جمعیت اور طاقت کا امتحان کہ وہ مسجد کی بے حرمتی برداشت کرتے ہیں یا نہیں۔ کر لیتے ہیں تو ان میں کوئی دم ختم نہیں۔ نہیں کرتے تو ان کے اور سکھوں کے درمیان مستقلاً نزاع و تصادم جاری رہے گا۔ سکھ کامیاب ہو گئے تو سمجھیں گے پنجاب ان کا ہے۔ وہ حسب سابق انگریزی حکومت کا ساتھ دیں گے اور کانگریس کی بڑھتی طاقت میں بھی ایک طرح کی روک ثابت ہوں گے۔ پنجاب بہرحال کئی طاقتوں کا اکھاڑا بن جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

۵- حضرت علامہ کی رائے کس قدر صائب تھی۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ انگریزی حکومت کے خاتمے میں اب صرف نو برس باقی ہیں۔

۶- مرحوم، اس وقت جج پنجاب ہائی کورٹ، ۱۹۴۷ء میں باؤنڈری کمیشن کے رکن، تقسیم ملک کے بعد ایک زمانے میں گورنر سندھ۔

۷- کہ ایک خاص مدت کے بعد قبضۂ مخالفانہ کو باقاعدہ قبضے کی شکل دے دی جائے۔

۸- میاں سر فضل حسین مرحوم کی۔

۹- دیکھیے ضمیمہ شہید گنج کتاب کے آخر میں۔

۱۰- Prince Bismarck۔ ۱۸۷۰ء میں جب نپولین ثالث نے جرمنوں سے شکست کھائی اور اتحاد المانیہ کی ابتدا ہوئی، بسمارک کی بدولت۔

۱۱- اور یہی کچھ بالآخر ہوا۔

۱۲- Bluffer

۱۳- گویا لائیڈ جارج کا اشارہ بیک وقت اٹلی، جرمنی اور روس سب کی طرف تھا۔ یہ تینوں نظام گو ایک

دوسرے سے مختلف تھے، لیکن تینوں کی روح غیر جمہوری اور اس لیے شخصی آزادی کے خلاف۔ لہٰذا ان میں اور برطانوی شہنشاہیت میں کسی وقت بھی تصادم ہوسکتا تھا۔ لائیڈ جارج اگرچہ اس وقت پیرانہ سالی کے ایام بسر کر رہا تھا اور وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہوئے بھی اسے چودہ پندرہ برس گزر چکے تھے، لیکن اس کی رائے بہرحال وقعت سے خالی نہیں تھی۔ اپنے زمانۂ اقتدار میں تو وہ گویا یہ سمجھتا تھا جیسے دنیا کا نوشتۂ تقدیر اس کے ہاتھ میں ہے اور جس کے پیشِ نظر کبھی حضرت لسان العصر نے کہا تھا:

بات کوئی ہے تو لائیڈ جارج میں آجکل دنیا ہے اس کے چارج میں

۱۴- ان معنوں میں کہ اس کی روح بھی جمہوری ہے، جیسے انگلستان کی۔

۱۵- اس لیے کہ فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کا زور اس زمانے میں بڑھ رہا تھا، بلکہ اندیشہ تھا کہ فرانس بھی شاید کمیونسٹ نظام زندگی اختیار کرلے۔

۱۶- یہ قطعۂ اشعار ارمغان حجاز میں موجود ہے اور اس کی اشاعت پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ معترضین نے اس قطعے پر قطعے لکھے، اخباروں میں مضامین شائع، ہوئے، پمفلٹ چھاپے گئے۔ لیکن آج یہ سب باتیں یاد سے محو ہوچکی ہیں۔ نہ کسی کو قطعات کا علم ہے نہ مضامین اور پمفلٹوں کا۔ ان قطعوں اور پمفلٹوں میں کوئی جان تھی نہ روح۔ برعکس اس کے حضرت علامہ نے ایک حق بات کہی تھی اور حق اپنی جگہ پر آج بھی قائم ہے۔

مخالفین سمجھے تھے کہ حضرت علامہ نے ایک ایسے عالم دین، پابند کتاب وسنت اور پیشوائے مذہب کی شان میں گستاخی کی ہے جس کے درس کتاب وسنت سے مدرسہ دیوبند فیض یاب ہورہا ہے۔ لیکن یہی تو اَمر تھا جس کی طرف حضرت علامہ اشارہ کررہے تھے کہ کیا غضب ہے جغرافی قومیت کے اس تصور کو جو مادیت پرستی پر مبنی اور مغرب سے آیا ہے مولانا کی حمایت حاصل ہے۔ حالانکہ کتاب وسنت میں اس کی کوئی سند ہے، نہ عالمِ اسلام نے کبھی اسے تسلیم کیا۔ حضرت علامہ کو مولانا کا احترام تھا اور احتراماً ہی انھوں نے شکایت بھی کی۔ انھیں تعجب تھا مولانا نے ایک ایسی بات کیسے کہ دی جس سے اسلام کے نظام اجتماع وعمران کی نفی ہوتی ہے۔ وہ ان کی دلی آزادی نہیں کررہے تھے۔ ان کا عمل ہمیشہ اس اُصول پر رہا جو اپنے لیے وہ خود ہی قائم کرچکے تھے۔ بانگ درا میں ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے

۱۷- ارسطو کا باپ البتہ طبیب تھا۔

۱۸- جیسا کہ حضرت علامہ کے استاد مولانا میر حسن کی مثال ہے کہ اگرچہ مطب نہیں کرتے تھے، لیکن طب کا درس دیتے تھے۔

۱۹- دیکھیے تشکیل جدید، خطبہ اول۔

حواشی

۱- شہید گنج کے بارے میں۔

۲- Dr. Stanley Jones، سول ملٹری گزٹ میں۔

۳- اس لیے کہ تہذیب جدید کی روح سرتا سر مادی ہے اور مادیت کی رُو سے جو کچھ ہے مادی اسباب و علل کی کارفرمائی، حتیٰ کہ انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لہٰذا نہ اس کی ہستی کے کچھ معنی ہیں، نہ ماضی کے ورثۂ اخلاق اور افکار و خیالات کی کوئی قدر و قیمت...... اسے حال پر کہ ہر لحظہ متغیر ہے...... گرفت حاصل ہے، نہ مستقبل کے بارے میں اعتبار و یقین۔ افراد ہوں یا اقوام، سب ہوا و ہوس سے مغلوب اور غضب و تغلب کی دوڑ میں باہم دست و گریباں ہیں۔ اس حسیت پسند ثقافت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا رشتہ اس کے باطن اور ضمیر سے کٹ گیا ہے۔ دیکھیے تشکیل جدید، خطبہ ہفتم: "Man has ceased to live soulfully, ie., from within."...... انگریزی نسخہ، ۱۹۶۰، صفحہ ۱۸۷۔

۴- حضرت علامہ کی نظر ہمیشہ حقائق پر رہی۔ لیکن عالم اسلام کے اس اخلاقی زوال اور تسفل کے باوجود، جس کی طرف وہ اشارہ فرمارہے تھے، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے اسباب و علل کیا ہیں اور اس لیے مداوا کیا؟ لہٰذا وہ اپنی 'کشت ویراں' سے نا امید بھی نہیں تھے۔ وہ خوب جانتے تھے مسلمانوں کے سینے میں دل ہے اور یہ دل عشق کی تڑپ سے خالی ہیں۔ ہمیں اپنے نصب العین کا احساس بھی ہے لیکن خرابی ہے تو یہ کہ ہم نہیں جانتے فرد اور جماعت کی زندگی میں اس کی ترجمانی کیسے ہو:

شبے پیش خدا نگریستم زار — مسلماناں چرا خوارند و زارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

ارمغان حجاز

۵- اور پاکستان کا قیام حضرت علامہ کی اس پیشین گوئی کا ثبوت۔

۶- پاکستان کی اصطلاح کس نے وضع کی، حضرت علامہ نے یا چودھری رحمت علی مرحوم نے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چودھری صاحب نے، اس لیے کہ چودھری صاحب ہی نے ہندوستان کی جغرافی تقسیم کے اعتبار سے مختلف خطوں کے لیے مختلف نام وضع کر رکھے تھے جن کو وہ اپنی تصنیفات اور بیانات میں اکثر استعمال کرتے۔ حضرت علامہ کا نقطۂ نظر اس کے برعکس جغرافی نہیں تھا، اسلامی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریاست خواہ اس کی اساس وطن ہو، یا کوئی غیر مادی اُصول، کسی جغرافی خطے ہی میں قائم ہوگی۔

ثانیاً الہ آباد کے خطبہ صدارت میں انھوں نے یہ تو کہا تھا کہ ایک ہندی اسلامی ریاست کا قیام بالآخر

دوشنبہ: ۳۱/ جنوری

گفتگو پھر وہی عالم اسلام کے اخلاقی اور ذہنی انحطاط کی تھی، مسلمانوں کی زبوں حالی۔ حضرت علامہ نے بڑے افسوس ناک لہجے میں فرمایا "ہماری روحانی حالت اچھی نہیں۔ مسلمان کیا ہیں؟ راکھ کا ڈھیر!"[۱]

راجا صاحب بھی بیٹھے تھے۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ حضرت علامہ نے خود ہی فرمایا "ہم نے آنکھ کھولی تو لایعنی روایات، بدعات اور توہمات کا زور تھا۔ لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہابی تحریک پھیل گئی۔[۲] بخاری اور مسلم[۳] کی اشاعت ہونے لگی اور صورتِ حالات بہت کچھ بدل گئی۔"[۴]

حضرت علامہ دم کشی کے باعث ذرا دیر کے لیے رُک گئے۔ پھر ارشاد ہوا "اب زمانہ قرآن مجید کے مطالعہ کا ہے۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو خود ہی سمجھ لیں گے ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے اور انھیں اپنی زندگی میں کس منہج پر قدم اُٹھانا چاہیے۔"[۵]

فرمایا "قوموں میں تبدیلیاں دفعتاً نہیں، بلکہ چپ چاپ اور بتدریج رونما ہوا کرتی ہیں۔ یہ ایک عمل ہے جو آپ ہی آپ شروع ہوتا اور آپ ہی آپ جاری رہتا ہے۔"[۶]

حواشی

۱- بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
بالِ جبریل

۱۱- شاید اس بنا پر کہ وہ شبہ اہلِ کتاب ہیں، لہٰذا حکومت ان سے جزیہ لیتی تھی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر راجپوت مسلمان ہوجاتے تو مغلوں کو شاید انھیں بیٹیاں دینے سے بھی انکار نہ ہوتا؟

۱۲- حضرت علامہ ''کو کبوتروں سے بڑی دل چسپی تھی، بلکہ ایک زمانے میں انھوں نے خوب خوب کبوتر پال رکھے تھے۔ یہ شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ جس میں راقم الحروف کے برادرِ عم زاد سیّد محمد تقی مرحوم بھی ان کے شریک تھے۔ اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف جب قیام دہلی میں پہلی مرتبہ مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوا اور بسلسلۂ تعارف ان سے حضرت علامہ سے میرے تعلق کا ذکر کیا گیا تو کہنے لگے ''میں ان کے علم و فضل کا قائل ہوں، لیکن یہ خودی کیا چیز ہے؟ میں خودی کو نہیں سمجھا۔ تم سمجھاؤ خودی ہے کیا؟''

میں نے عرض کیا ''میں یہ جرأت کیسے کرسکتا ہوں کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں۔ یوں بھی جب بایں علم و فضل آپ نہیں سمجھے کہ خودی کیا ہے تو مجھ ایسا کم علم انسان اسے کیا سمجھے گا۔''

اس پر مولانا مسکرا کر کہنے لگے ''اقبال نے جب اسرار خودی لکھی اور اس کا ایک نسخہ ہمیں بھیجا تو ہم نے اس کی بڑی تعریف کی اور ہم واقعی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے علم و فضل کو کوئی نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو بصیرت دی ہے، کسی کو نہیں ملی۔ لیکن جب ہم نے انھیں لکھا کہ یہ جو آپ نے بار بار خودی کی طرف اشارہ کیا ہے تو ہم نہیں سمجھے خودی کیا ہے؟ ہمیں سمجھا دیجیے، تو اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا ہمارے پاس کبوتروں کا ایک نہایت اعلیٰ جوڑا ہے، اجازت ہو تو آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔''

اتنا کہہ کر مولانا نے سامعین کی طرف دیکھا اور کہنے لگے ''ہم ان کا مطلب سمجھ گئے۔''

مولانا شدت سے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ حضرت علامہ شاید انھیں یہ سمجھا رہے تھے کہ جس چیز کے بارے میں آپ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں وہی بار بار اور نئے سے نئے روپ میں آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ یہی خودی ہے۔

مولانا کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

۱۳- ممکن ہے کوئی ماہر حیوانات حضرت علامہ کے اس ارشاد پر نظر ڈال سکے جو انھوں نے گھریلو کبوتروں کے بارے میں فرمایا۔

۱۴- تا کہ ان سب عوامل کی نفی ہوتی رہے جو اخلاقی اور اجتماعی، یا نفسیاتی اعتبار سے نسلی تعصبات کو ہوا دیتے ہیں۔

۱۵- حضرت علامہ نے یہ الفاظ انگریزی میں فرمائے تھے: Line of least resistance۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو حضرت علامہ کا بیان، بعنوان اسلام اور احمدیت۔

۱۶- اور جن کو مستشرقین نے بظاہر بڑے معصومانہ انداز میں ہوا دی، مثلاً براؤن نے تاریخ ادبیات ایران اور

دوشنبہ: ۷؍فروری

حسب قرارداد علی الصبح حاضر ہوگیا۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟''

میں نے عرض کیا ''کل کے مشورے نے بہت طول کھینچا۔ آپ کا ارشاد تھا اشعار نقل کیے بغیر نہ جاؤں، لیکن ایک تو وقت زیادہ ہوگیا تھا، دوسرے مجھے کچھ کام تھا اس لیے ٹھہر نہ سکا۔ میں نے علی بخش سے کہ دیا تھا صبح جلدی حاضر ہو جاؤں گا؟''

میں نے بیاض اُٹھائی تو حضرت علامہ نے سرہانے کی طرف پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی تپائی سے کاغذ کا ایک پرزہ اُٹھایا جس پر کہیں کہیں ایک آدھ لفظ درج تھا۔ پھر اس پر نظر ڈالی اور فرمایا ''لکھو۔'' میں نے قلم ہاتھ میں لیا تو حضرت علامہ نے یکے بعد دیگرے ایک ایک شعر لکھوانا شروع کیا۔ یہ چھ شعروں کی ایک نظم تھی[1] جسے میں نے درج بیاض کر دیا۔ پھر عرض کیا ''کل کا مشورہ کیسا رہا؟''

ارشاد ہوا ''کل یہ لوگ بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کا خیال پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کا ہے۔ لیکن میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے تو صاف صاف کہ دیا تھا میں اس کے خلاف ہوں۔''

اتنے میں چودھری صاحب آ گئے۔ وہ بڑے برافروختہ معلوم ہوتے تھے۔ السلام علیکم کے بعد انھوں نے انقلاب اور زمیندار تپائی پر رکھ دیے اور کہنے لگے ''ذرا دیکھیے تو، انقلاب نے کیا خبر شائع کر دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کل کا مشورہ ایک چال تھا اور وہ یہ کہ جاوید منزل کی اس ملاقات کو جلسے کا نام دے کر یہ ظاہر کیا جائے کہ آپ بھی پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کے حق میں ہیں۔''

اس پر حضرت علامہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: ''ھذا بہتان عظیم۔''

فرمایا ''چودھری صاحب! اس خبر کی فوراً تردید ہو جانی چاہیے۔ میں ہرگز اپیل کے حق میں نہیں ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ حضرات دیر تک بیٹھے آپس میں مشورہ کرتے رہے، لیکن میں نے معذرت کردی تھی۔ میں تو جلد ہی اُٹھ کر پلنگ پر آلیٹا تھا۔ پھر جب یہ حضرات گئے تو اتنا ضرور کہتے گئے کہ ہماری رائے اپیل کرنے کی ہے، لیکن میں نے مکرر اپنی رائے کا اظہار کردیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں۔''

حضرت علامہ نے بات ختم کی تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا انقلاب اور زمیندار نے ایسی غلط بیانی کس لیے کی۔ یہ بڑی غیر ذمہ داری کی بات تھی۔ زمیندار کی طرف سے تو خیر کہا جاسکتا تھا کہ اسے جیسی اطلاع ملی شائع کردی، لیکن انقلاب نے ایسا کیوں کیا؟ مدیران انقلاب تو اس مشورے میں شامل تھے۔ انھیں معلوم تھا حضرت علامہ اپیل کے خلاف ہیں۔ بالآخر طے پایا کہ جو ہوا سو ہوا، اب مصلحت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی طرف سے فوراً ایک تردیدی بیان شائع کردیا جائے۔ لہٰذا میں نے پھر قلم دان اُٹھایا اور حضرت علامہ اور چودھری صاحب کے باہم مشورے سے ایک مختصر سا بیان لکھا۔ بیان صاف ہوگیا تو حضرت علامہ نے مجھ سے فرمایا کہ آج ہی حضرات سالک و مہر سے ملوں اور ان سے کہہ دوں کہ اس خبر کی تردید شائع کردیں۔

اس کے بعد چودھری صاحب تو دفتر چلے گئے اور علی بخش نے یہ دیکھ کر کہ دھوپ نکل آئی ہے حضرت علامہ کا پلنگ باہر صحن میں ڈال دیا۔ حضرت علامہ صحن میں تشریف لے آئے، لیکن ان کی طبیعت بڑی مکدر تھی۔ انھیں رنج تھا کہ ان حضرات نے جو کل مشورے کے لیے آئے تھے محض اپنی مصلحت جوئی اور مفاد پسندی کے خاطر ایک ایسی بات ان سے منسوب کردی جس پر انھوں نے ہرگز ہرگز رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ایسی غلط بیانی کیوں کی؟ اس جھوٹ سے فائدہ؟

حضرت علامہ بار بار فرماتے ''افسوس ہے ایک تو اس فریق پر جو برسر اقتدار ہے اور جس نے مسجد کو گرتے ہوئے دیکھا اور چپ چاپ خانہ خدا کی بے حرمتی برداشت کی، مگر پھر جب مسلمانوں کی غیرت ملی نے جوش مارا تو اس نے بھی بہ تقاضائے مصلحت محسوس کیا کہ انہدام مسجد پر احتجاج لازم ہے اور عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اب عدالت سے کورا جواب ملا ہے تو

فرمایا ''اسی لیے تو میں نے لکھا ہے کہ بقاے دوام ایک انعام ہے، ہمارا حق نہیں۔ ہمیں چاہیے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔''

پھر فرمایا ''بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک فطرت انسان ہے، دوسری جانب یہ مادی کائنات جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ خودی کا تقاضا ہے احساس ذات اور ذات کا یہ کہ اس کے بالمقابل اس کا کوئی غیر موجود ہو۔ لہٰذا یہ کائنات جس کا ہر جز ازسمک تا سماک اس کی تعمیر وتخریب میں حصہ لیتا ہے اسے اپنا غیر نظر آتی ہے۔ بایں ہمہ یہی غیر، جسے ہم کائنات قرار دیتے ہیں، مادی بقاے دوام میں حارج نہیں۔''

میں نے ایک طرح سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ''مگر ذہن انسانی اس غیر سے مغلوب [illegible] ہے۔ میرا مطلب ہے مادیت سے۔''

ارشا ہوا ''کیسے؟''

میں نے عرض کیا ''بطور ایک امر واقعی کے اور وہ یوں کہ خودی کا ظہور چونکہ کائنات میں ہوتا ہے، کائنات ہی میں وہ نشوونما حاصل کرتی اور کائنات ہی میں بالآخر گم ہو جاتی ہے، لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے کائنات کی ایک شان، یا اس کی مخفی اور پراسرار قوتوں کا کرشمہ ہے۔''

ارشاد ہوا ''یہ صحیح ہے۔ لیکن کائنات کیا ہے؟ بظاہر ایک مادی وجود، مگر جو ممکن ہے اپنی کنہ میں روح ہو۔[١٩] جدید سائنس کے نظریات اس باب میں بڑے معنی خیز ہیں۔[٢٠] ہیگل نے کبھی کہا تھا کہ حقیقتِ مطلقہ دراصل ایک ذہن ہے۔ سائنس کو البتہ اس ذہن کے منفرد اور سزاوار عبادت ہونے سے انکار ہے۔[٢١] مطلب یہ کہ کائنات کا ذہن ہونا ازروے سائنس محال نہیں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ذہن انفرادی ہو۔''[٢٢]

میں نے عرض کیا ''اور کائنات اس کا عمل؟''[٢٣]

فرمایا ''بے شک۔''

''میک ٹے گرٹ کی رائے اس بارے میں کیا تھی؟''

''یہی کہ مادے کو مادہ سمجھنا غلط ہے۔ کائنات میں وجود صرف خودی کا ہے۔''[٢٤]

میں نے پوچھا ''اور اس کے نظریہ عشق کی بنا کس بات پر ہے؟''

''اس بات پر کہ عشق ہی جوہر ہے زندگی کا۔ عشق ہی ہمارے جملہ مسائل کا حل اور مداوا

میں جب ہم فنا پر زور دیتے ہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ہماری توجہ صرف اس چیز پر ہے جو عشق کا مقصود ہے اور جس کی خاطر ہم سب کچھ بھول رہے ہیں۔ لیکن یوں فنا کے اس عالم تصور پر استدلال کرنا غلطی ہے جس کا مطلب ہے نفی ذات۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہماری ہستی ہمارے مقصود سے ہے۔ یہ فنا تو عین بقا ہے صوفیۂ اسلام نے بھی اسی لیے فنا کو بقا سے تعبیر کیا ہے۔"[۲۹]

حضرت علامہ نے تھوڑی دیر کے لیے سکوت فرمایا۔ انھیں آرام کی ضرورت تھی۔ اسی اثنا میں علی بخش نے دوا کھلائی، چلم بدلی اور حضرت علامہ کے پاؤں دابنے لگا۔ یوں ذرا ستا کر حضرت علامہ پھر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کا جی چاہتا تھا میں کوئی بات کروں، لیکن میں نے محسوس کیا حضرت علامہ تھک گئے ہیں، ان سے اور زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ یوں بھی مجھے حضرات سالک و مہر سے ملنا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی۔ دوپہر کب کی ہو گئی تھی۔

شام کے قریب پھر حاضر ہوا۔ حضرت سالک و مہر سے ملاقات کی کیفیت بیان کی۔ عرض کیا انھیں تردیدی بیان شائع کرنے سے انکار ہے۔ وہ کہتے ہیں ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا اور پھر ان سے ملاقات کی ساری کیفیت بیان کر دی۔[۳۰]

حضرت علامہ نے جیسے جیسے میرا بیان سنا ان کی کبیدگی خاطر بڑھتی چلی گئی۔ انھیں رنج تھا کہ مدیران انقلاب نے باوجود دیرینہ روابط اور دعویٰ مودت کے ان کا تردیدی بیان کیوں شائع نہیں کیا۔ وہ ایک جھوٹ کو کیوں فروغ دے رہے ہیں۔ میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ علی بخش چائے لے آیا۔ حضرت علامہ نے چائے پی اور علی بخش ان کے پاؤں دابنے لگا تو میں نے اس خیال سے کہ ان کا ذہن کسی دوسری جانب منتقل ہو جائے عرض کیا، مولانا حسین احمد کے طرف دار کہتے ہیں مولانا سے زیادہ "بمصطفیٰ برساں خویش، پر عمل کس کا ہوگا۔ انھوں نے یہ تو نہیں کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ کہا ہے تو یہ کہ جو لوگ کسی وطن میں بستے ہیں اپنے آپ کو ایک قوم ہی کہا کرتے ہیں۔"

حضرت علامہ نے فرمایا "تو یوں ہی سہی۔ ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں۔ وہ ایک [illegible] کر دیں اور صاف صاف فرما دیں کہ اسلام کی رُو سے وطن بنائے قومیت نہیں۔ وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأت ایمانی کے اعتراف میں تین کے بجائے چھ شعر کہہ دیں گے۔"

ارشاد ہوا ''ایک رباعی ہو رہی ہے۔ احتیاطاً یادداشت کے طور پر لکھ رکھو۔''

میں نے بیاض اُٹھائی اور قلم دان لے کر بیٹھ گیا۔ ارشاد ہوا:

ندانی نکتہ دین عرب را — کہ گوئی صبح روشن تیرہ شب را

اگر قوم از وطن بودے محمد — ندادے دعوت دیں بولہب را

ارشاد ہوا ''مغرب کی لادینی لوتھر کی تحریک سے پیدا ہوئی۔ اس لیے کہ جب حصول اقتدار کے جذبے نے کلیسا کی سیادت ختم کر دی تو لازماً کسی ایسی اساس کی ضرورت پیش آئی جو قوموں کے نظام اجتماع کو درہم برہم نہ ہونے دے۔ یہی ضرورت تھی جس نے اہلِ یورپ کو وطن سے نسل کی طرف مائل کیا۔ آگے چل کر یہی وطنیت دہریت کا سبب بنی[۳۱] مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔''

میں نے عرض کیا، اب تو ایشیا میں اس قسم کی دہریت کا اثر پھیل رہا ہے۔ اخلاقی قیود کچھ تو ٹوٹ چکی ہیں اور کچھ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ جنگ سے قبل نہ یہ ذوق عریانی تھا، نہ حسن کے مقابلے۔ ڈاکٹر جونز کا کہنا کہ یہ زمانہ مرگ قلب کا ہے کس قدر صحیح ہے۔ قلب ہی زندہ نہیں تو تزکیۂ ذات ہو، یا تطہیر سیاست، اس کی توقع بے سود ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کیا نفسیاتی محرکات ہیں جن کے باعث انسانوں کے اخلاق اس طرح بدل گئے ہیں؟''

ارشاد ہوا ''یہ جنگ کا نتیجہ ہے۔ جنگ سے اگر ایک طرف صفات عالیہ کو تحریک ہوتی ہے تو دوسری جانب ادنیٰ اور سفلی سے سفلی جذبات اُبھر آتے ہیں۔ یوں بھی قتل اور خوں ریزی کا نتیجہ اجتماعی لحاظ سے ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ قومیں بے دریغ ایک دوسرے پر ظلم و ستم کرتی ہیں۔ انسان جب بے دردی اور سفاکی کے ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے زندگی نام ہے محض غلبہ و تغلب کا۔ اس میں کوئی اخلاقی قانون کام نہیں کرتا، نہ دنیا کسی اخلاقی نظام کے سہارے چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ پر پابندیاں عائد کر دیں اور ایسے قوانین وضع کیے جن سے اخلاق عالیہ کی حفاظت ہوتی ہے۔''[۳۲]

میں نے عرض کیا آپ کا ایک شعر ہے:

باضعیفاں گاہ نیروے پلنگاں می دھند

شعلۂ شاید ز فانوس حباب آید بروں

۲۔ یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال میں اس واقعے کو جس طرح بیان کیا ہے صحیح نہیں اور اس کی وجہ یہ کہ مصنف نے سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرلیا۔ یہاں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ مولوی صلاح الدین مرحوم، مدیر ادبی دنیا نے مجھ سے ایک مرتبہ دریافت بھی کیا تھا کہ واقعہ کیا ہے۔ انھوں نے پورا واقعہ سنا تو ان کی اور بٹالوی صاحب کی شاید اس سلسلے میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ واقعہ بہرحال اسی طرح پیش آیا جس طرح میں نے بیان کیا ہے کہ نواب مظفر خان اور دوسرے حضرات غیر متوقع طور پر جاوید منزل آئے، حضرت علامہ سے ملے، اپیل کے بارے میں مشورہ کیا، حضرت علامہ نے اس سے اختلاف کیا اور بہ سبب ضعف علالت پھر خواب گاہ میں آکر بستر میں لیٹ گئے۔ مگر یہ حضرات ان کی اجازت سے دیر تک بیٹھے رہے اور پھر انتہائی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ...... جس پر حضرت علامہ نے فرمایا تھا ''ھذا بہتان عظیم'' ...... ایک اعلان شائع کردیا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کے بارے میں جو مشورہ ہوا اس میں حضرت علامہ بھی شریک اور اپیل کے حق میں ہیں۔

بٹالوی صاحب لکھتے ہیں کہ نیازی صاحب اتفاقاً وہاں موجود تھے (حالانکہ میں اتفاقاً نہیں، شب و روز وہاں موجود رہتا تھا)۔ پھر یہ کہ حضرت علامہ نے ان کے کان میں کہا یہ شخص (یعنی وہ شخص جس کے متعلق خیال تھا کہ یونینسٹ مسلمان اراکین میں انہدام مسجد کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر اس پر عاید ہوتی ہے) یہاں کیوں آیا ہے؟

حضرت علامہ نے ایسا ہرگز نہیں کہا اور نہ اس طرح چپکے سے میرے کان میں کچھ کہنا ان کے شایان شان تھا، خواہ انھیں ان کا آنا کیسا بھی ناگوار ہوتا۔

پھر جب حضرت علامہ نشست گاہ سے اُٹھ کر خواب گاہ میں تشریف لے گئے تو میں نے انھیں نہیں دیکھا، اس لیے کہ دیوار کی اوٹ تھی اور یہ حضرات ابھی برابر گفتگو کررہے تھے۔ میں سمجھا حضرت علامہ بھی گفتگو میں شریک ہیں۔ پھر جب حضرت علامہ خواب گاہ میں تشریف لے گئے تو مجھے طلب بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں علی بخش سے یہ کہہ کر رخصت لے چکا تھا کہ علی بخش دیر ہوگئی ہے، حضرت علامہ سے معذرت کردینا، علی الصبح حاضر ہوجاؤں گا۔

۳۔ فلسفی را با سیاست داں بیک میزاں مسنج — چشم او خورشید کورے دیدۂ او بے نمے
ایں تراشد قول حق را حجت نااستوار — ویں تراشہ قول باطل را دلیل محکمے

پیام مشرق

پھر یہ سب سیاست دان ہی تو تھے جو حضرت علامہ سے مشورے کے لیے آئے تھے۔

۴۔ سخن میں سوز الٰہی ہاں سے آتا ہے — یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

حضرت علامہ نے میری بات سنی تو فرمایا ''یہ کہنا کہ علماے اسلام ان حقائق سے بے خبر تھے، صحیح نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان کی نظر ہر بات پر تھی۔ وہ تہذیب و تمدن اور اجتماع و عمران کے مسائل سے غافل تھے نہ علم و حکمت اور مابعد الطبیعی افکار سے، جس میں قرآن مجید نے ان کی رہنمائی کی۔ یہ انھیں کا تو کہنا تھا کہ قرآن مجید خلاصۂ کائنات ہے۔''

ارشاد ہوا ''قرآن مجید نے کہا ہے: شجر و حجر سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔''[۳]

میں نے کہا ''لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔''[۴]

[illegible]مایا ''یہ صحیح ہے۔ لیکن تم اس حقیقت کو اس طرح سمجھو جیسے میں نے اسرار خودی میں لکھا ہے:

سبزۂ بر دیں نمو روئیدہ است

یعنی اس کا دین، یا دوسرے لفظوں میں اس کی فطرت ہے نمو۔ لہٰذا یہ نمو ہی اس کا اسلام ہے۔ تسبیح کا مطلب ہے ذات الٰہیہ کی پاکیزگی کا اقرار اور سجدہ عبارت ہے اس کی اطاعت سے۔ لہٰذا کائنات کا ہر ذرہ زبان حال سے حقیقتِ مطلقہ کی تنزیہ کرتا اور اسی کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ پھر یہ اَمر اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ ہم اپنی ہستی کے لیے صرف اسی کے محتاج ہیں۔

میں خاموش تھا۔ ارشاد ہوا ''میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو۔[۵] کوئی نئی بات کہی ہے تو صرف یہ کہ وہ حقیقت جسے ہم خودی سے تعبیر کرتے ہیں، جو بڑھتی، پھیلتی، نمو پاتی، طاقت اور قدرت حاصل کرتی ہے، وہ ایک ایسا عمل ہے جس کے مادی حیاتی اور نفسیاتی قوانین کی نوعیت قرآن پاک نے واضح الفاظ میں بیان کردی ہے۔ مفکرین اسلام نے البتہ اس باب میں جو غلطی کی وہ یہ کہ یونانیت کے زیر اثر اس نکتے کو نظر انداز کر دیا جو خودی میں مضمر ہے۔[۶] خاقانی نے کیا خوب کہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی عہد کے کسی مبصر کے خیالات ہیں:

مرکب دین کہ زادۂ عرب است — داغ یونانش بر کفل منہید[۷]

اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ یونانیت کا داغ دھویا جائے۔ اب ہمیں فرنگیت کا داغ دھونا ہے۔''

میں نے کہا ''ہم لوگ تو خود ہی گرفتار فرنگ ہیں۔ یوں بھی فرنگ سے بے تعلق رہنا کیسے م[illegible]پ نے بھی تو مغربی فلسفے کا مطالعہ کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں آپ ایسا نہ کرتے تو وہ افکا[illegible]ت جن کو آپ نے اپنی شاعری اور خطبات میں پیش کیا ہے کہاں سے آتے؟''

ارشاد ہوا ''لوگ جاہل ہیں۔ وہ بات نہیں سمجھتے۔ انھیں اپنے ماضی کی مطلق خبر نہیں۔ وہ کیا جانیں افکارِ حاضرہ کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے[۸] یہ فلسفہ و حکمت تو خیر بڑی چیز ہیں، سیاست ہی کو دیکھ لو۔ مسلمانوں کے دلوں میں مغربی تصورات کا سکہ جم رہا ہے۔ اور تو اور یہ مولوی حسین احمد بھی کہہ رہے ہیں کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔''

پھر کچھ آب دیدہ ہو کر اور کچھ متاسفانہ لہجے میں فرمایا:

''حق را بفریبد کہ نبی را بفریبد
آں شیخ...... کہ خود را مدنی خواند''

ارشاد ہوا ''یہ شعر یونہی ہو گیا ہے۔ قابلِ اعتنا نہیں۔''

پھر فرمایا ''ذرا خیال تو کرو۔ ایک طرف دیوبند ہے اور درسِ حدیث، دوسری جانب یہ ارشاد کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔''

دوپہر ہو گئی۔ علی بخش نے کھانے کا پوچھا۔ ارشاد ہوا ''لے آؤ۔''

حضرت علامہ چاہتے تھے میں بات کیے جاؤں۔ انھوں نے کروٹ لی، حقے کا کش لگایا اور مسلمانوں کے ذہنی انحطاط پر تبصرہ کرنے لگے۔ فرمایا ''ذہنی اضمحلال پیدا ہوا تو تہذیب جدید کے مقابلے کی تاب بھی نہ رہی۔''

ارشاد ہوا ''ہند ہو یا بیرونِ ہند، ہر کہیں ایک سی کیفیت ہے۔ زندگی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے۔'' مطلب یہ تھا کہ عالمِ اسلام میں کسی ایسی تحریک کے آثار نظر نہیں آتے جس سے اس کے زوال و انحطاط کا سدِباب ہو سکے۔

میں نے عرض کیا ''شاہ فاروق کی شادی ہوئی، مگر یہ ساری تقریب مغربی رسم و رواج کے مطابق ادا کی گئی۔ شیخ الازہر[۹] کی حمیت دینی کے افسانے یوں تو بہت سننے میں آئے تھے، لیکن وہ بھی اس تقریب میں شریک تھے اور ایک لفظ تک اس کے خلاف نہیں کہا۔ تصویریں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کسی فرنگی شہزادے کی رسم کتخدائی ادا ہو رہی ہے۔''

...وا ''جب کوئی قوم گر جاتی ہے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ میں نے جاوید نامہ میں ...مان اپنی قوت تخلیق کھو کر دوسروں کی تقلید پر اتر آئے ہیں:

تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

چہار شنبہ: ۹ر فروری

سہ پہر ہو رہی تھی کہ میں حاضر ہوا۔ حضرت علامہ کو افسوس ہے شہید گنج کے سلسلے میں مسلمانوں کو برابر دھوکا دیا جا رہا ہے، حالانکہ ضرورت اقدام کی ہے، کوئی ایسا اقدام جس سے مسلمانوں کی جمعیت مضبوط ہوتی۔

فرمایا "ہماری حالت تو جو ہے سو ہے، لیکن اس انگریزی حکومت کو دیکھیے جسے 'ڈیماکریسی' اور رائے عامہ کے احترام کا دعویٰ ہے۔ اگر 'ڈیماکریسی' کی یہی شان ہے جس کا ثبوت حکومت دے رہی ہے تو ایسی 'ڈیماکریسی' کسی شریف قوم میں پرورش نہیں پا سکتی۔"

ارشاد ہوا "مغرب کا نظام مدنیت رو بہ انحطاط ہے۔ ہٹلر ہی کو دیکھ لو اس کی آمریت سے کلیسا بھی محفوظ نہیں رہا۔[1] عالمِ اسلام میں بھی بڑے بڑے مستبد اور جبار و قہار گزرے ہیں، لیکن اس قسم کی مطلق العنانی کی مثال تو ان کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ انھیں بھی اتنے اختیارات حاصل نہیں تھے۔"

حضرت علامہ رُک رُک کر باتیں کر رہے تھے۔ میں حتی الوسع کوئی سوال نہ کرتا۔ مطلب یہ تھا انھیں آرام ملے۔ انھوں نے دو ایک بار بچوں کا پوچھا۔ دو ایک بار علی بخش آیا، چلم بدلی، دوا کھلائی اور پاؤں دابنے لگا۔ حضرت علامہ نے کروٹ لی۔ شاید تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔

چودھری صاحب آ گئے، پھر راجا صاحب۔ شام ہو چکی تھی۔ قرشی صاحب کا انتظار تھا۔ وہ آئے تو حضرت علامہ نے طبیعت کا حال بیان کیا۔ پھر شہید گنج، اپیل اور یونینسٹ پارٹی کی باتیں چل نکلیں۔ حضرت علامہ سنتے اور محظوظ ہوتے رہے۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ حضرت علامہ نے حقے کے دو ایک کش لیے۔ علی بخش چائے لے آیا۔ حضرت علامہ نے چائے پی، کچھ آرام فرمایا، پھر ارشاد ہوا ''مسٹر ہیوم[۵] آئے تھے۔ کہنے لگے، کسی صوفی بزرگ کا پتا دیجیے۔ میں نے کہا یہ تو ذرا مشکل سی بات ہے۔ ہماری عمر گزر گئی، کوئی مردِ کامل نہ ملا۔

فرمایا ''مسٹر ہیوم کہتے ہیں پروفیسر میسے نوں نے خود ان سے کہا تھا کہ اگر وہ حلاج کی تحریریں نہ پڑھتے تو دھریہ ہو جاتے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا: ہمارا بھی شاید یہی حال ہوتا، لیکن ہماری مدد رومی نے کی۔ آپ غزالی پڑھ رہے ہیں۔ آپ یہ بات غزالی سے حاصل کر لیجیے۔''[۶]

حضرت علامہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا ان کا ذہن کسی گہرے فکر میں ڈوب گیا ہے۔ پھر جب چند منٹ کے بعد 'یا اللہ' کہتے ہوئے ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور حقے کے دو ایک کش لیے تو میں نے اس خیال سے کہ مجھے کچھ کہنا چاہیے، عرض کیا ''کوئی شعر تو نہیں ہوا؟''

فرمایا ''نہیں۔''

شہید گنج کا ذکر آ گیا۔ ارشاد ہوا ''مرافعے کے حامی ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ ان کی مرضی ہے مسلمان خاموش رہیں، لیکن اس کی بجائے کہ اس خاموشی کی کوئی قیمت ادا کریں، اُلٹا ان سے چندہ وصول کر رہے ہیں۔ یہ چندہ نہیں ہے، جرمانہ ہے۔ عجیب بات ہے مسلمان نقصان اُٹھائیں اور جرمانہ بھی ادا کریں۔''

پھر بڑے دکھ بھرے لہجے میں فرمایا ''مسلمان بھی کیا سادہ لوح ہیں اور انھیں ہمدرد بھی ملے ہیں تو کیسے بے درد! کیسے شاطر!''

حضرت علامہ بڑے رنجیدہ خاطر تھے۔ قدرے سکوت کے بعد پھر فرمایا ''تعجب ہے ان لوگوں کی منافقت پر!'' اور پھر بعض کا نام لے کر کہنے لگے ''ان کی منافقت میں خلوص بھی ہے۔ کیسے مخلص منافق ہیں یہ لوگ!''

❁……❁……❁

جمعرات: ۱۰ رفروری

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ حاضر خدمت ہوگیا۔ خیریت مزاج پوچھی تو باتوں میں معلوم ہوا کہ پرسوں مولوی محمد علی[1] ملنے آئے تھے۔ دیر تک بیٹھے اور اپنی محبت اور مودت کا یقین دلاتے رہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ دولتانہ[2] بھی آئے تھے۔ بظاہر عیادت کے لیے، مگر اصل مدعا کچھ اور تھا۔ کہنے لگے "سنا ہے لیگ کا اجتماع لاہور میں ہو رہا ہے۔ ایسا ہوا تو شورش کا احتمال ہے۔ آپ جناح کو اطلاع کر دیجیے۔"[3]

دولتانہ سے حضرت علامہ کا ذہن یونینسٹ پارٹی اور یونینسٹ پارٹی سے دیوبند کی طرف منتقل ہوگیا۔ مسلمانوں کی رہنمائی نہ ارباب سیاست کر رہے ہیں نہ اربابِ مذہب۔ یہ کیا بات ہے؟ شاید یہی احساس تھا جس کے ماتحت فرمایا "کیوں نہ مولوی حسین احمد اور ان کے طرف داروں سے کہ دیا جائے کہ ہم قومیت کے مسئلے پر گفتگو کے لیے تیار ہیں، لیکن مدار بحث قرآن وسنت ہوگا۔"

پھر فرمایا "یوسف سلیم چشتی کہاں ہیں؟ انھوں نے تحریک وہابیت پر مضمون کیوں نہیں لکھا؟ اگر لکھیں تو مجھے دکھا دیں۔"[4]

صحت مزاج اور دواؤں کے سلسلے میں طبّی مرکبات کا ذکر آ گیا۔ خمیرہ گاؤزبان اور دواء المسک کی تعریفیں ہونے لگیں۔ اتفاقاً اسی وقت علی بخش دوا المسک کی ایک خوراک چمچے میں لیے آ گیا۔ حضرت علامہ نے بڑے مزے لے لے کر دوا کھائی اور کہنے لگے "بڑا افسوس ہے حکیم صاحب نے اس کی مقدار اتنی کم رکھی ہے...... نہ چار نہ چھ، فقط دو ماشے۔"

پھر فرمایا "قرشی صاحب آج شام ذرا جلدی تشریف لے آئیں۔ کچھ وقت نکال لیں تاکہ دواؤں اور ان کے استعمال کا ایک نقشہ تیار ہو جائے۔"

حواشی

۱- مرحوم امیر جماعتِ احمدیہ، لاہور۔

۲- مرحوم نواب احمد یار خاں۔

۳- یہ گویا یونینسٹ پارٹی کی طرف سے اعلان جنگ تھا۔ خیال تھا قائداعظم اس دھمکی سے مرعوب ہو جائیں گے۔ حضرت علامہ بھی اسے خاطر میں نہیں لائے، بلکہ ان کا یہ اصرار بڑھ رہا تھا کہ لیگ کا اجلاس لاہور ہی میں ہونا چاہیے، گو ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا۔ پھر اس ملاقات سے یہ بھی مطلب تھا کہ اس قسم کی لطیف دھمکی سے شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت علامہ کی رائے اس باب میں کیا ہے، یا یہ کہ اربابِ لیگ کس فکر میں ہیں؟

186

۴- جیسا کہ راقم الحروف اس سے پہلے لکھ چکا ہے حضرت علامہ تحریک اہلِ حدیث اور تحریک وہابیت میں فرق کرتے تھے۔ علمائے اہلِ حدیث کی خدمات کے وہ دل سے قائل تھے اور ان کا ذکر ہمیشہ دلی احترام سے کرتے۔ وہابیت ان کے نزدیک وہ غلط فرقہ بندی تھی جس کے متشددانہ عقاید اور تنگ نظری نے سیاست میں ایک نہایت غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ پھر اس روش کی ایک تاریخ بھی ہے۔ لہٰذا یوسف سلیم چشتی جب ایک بار حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بعض سیاسی اور مذہبی خیالات کے پیشِ نظر اس تحریک پر گفتگو کرنے لگے تو حضرت علامہ نے فرمایا: کیا اچھا ہو جو آپ اس موضوع پر ایک مضمون لکھ دیں۔ لیکن چشتی صاحب معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ نہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نہ مضمون لکھا۔

۵- Mr. Hume، شاید اس زمانے میں حکومت پنجاب کے سیکرٹری۔

۶- یوں بھی کہ مسٹر ہیوم عیسائی تھے اور ہمیں معلوم ہے کہ مسیحی علم کلام، لہٰذا یورپ کے مذہبی دل و دماغ پر غزالی کا اثر نہایت گہرا ہے۔

❀.....❀.....❀

جمعۃ المبارک: ۱۱ر فروری

آج عید تھی، عید الاضحیٰ۔

نماز عید سے واپس آیا تو میں نے عزیزی نصیر[1] سے کہا ''حضرت علامہ کی خدمت میں ہو آئیں۔ یہ فریضہ ابھی ادا ہو جانا چاہیے۔''

سلامت بھی ساتھ تھے۔ جاوید منزل پہنچے اور صحن میں داخل ہوئے تو اول علی بخش کو عید کی مبارک باد دی۔ مصافحہ کیا، بغل گیری ہوئی، پھر حضرت علامہ کا حال پوچھا۔ علی بخش نے کہا ''اللہ کا فضل ہے۔ اچھے ہیں۔ ملک برکت علی،[2] غلام رسول خاں[3] اور شیخ عظیم اللہ[4] سے رہی ہیں۔ عید کی مبارک باد دینے آئے تھے۔''

سلامت نے کہا ''ہم بھی اسی غرض سے آئے ہیں۔ اگر گفتگو نجی نہیں تو حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں؟''

علی بخش نے کہا ''شوق سے۔ لیگ ہی کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت علامہ کو ہشاش بشاش پایا۔ عید کی مبارک باد دی۔ صحت کا پوچھا۔ حسبِ معمول فرمایا ''الحمدللہ۔ اچھا ہوں۔''

ملک صاحب اور خاں صاحب سے دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ ان سے بھی مبارک باد عرض کی گئی اور وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ یوں سلسلۂ گفتگو چند منٹ کے لیے منقطع ہو گیا۔ لیکن پھر جب ہم خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو حضرت علامہ نے خاں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ یونینسٹ پارٹی لیگ کے اجتماع پر اس لیے مصر ہے کہ جناح قانون شکنی کی مخالفت کریں گے، لیگ کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی، لہٰذا مسلمان لیگ سے بدظن ہو جائیں گے اور کامیابی یونینسٹ پارٹی کو ہوگی[5] میری رائے اس کے

ہیں بہت خوب ہے۔ مگر خواجہ صاحب! آپ ان اشخاص، یا شخص کا نام کیوں نہیں لے دیتے جنھوں نے، یا جس نے ایسا کیا؟ کیوں نہ مسلمان جان لیں ان کے یہ ہمدرد اور بہی خواہ ہیں کون؟''[۲]

لیکن خواجہ صاحب خاموش رہے۔ انھوں نے حضرت علامہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا جیسے سب کو معلوم ہے کہ مسجد کیوں اور کس کے ایما پر گرائی گئی۔

پھر مجھ سے فرمایا ''کوئی خبر ہے؟''

میں نے عرض کیا ''خبر تو کوئی نہیں ہے، بجز اس کے کہ کہیں نہ کہیں بلوہ ہو جاتا ہے۔''

اس پر فرمایا ''آج باجے کا سوال ہے، کل قربانی کا جھگڑا۔ ان سب باتوں کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بربنائے قومیت کوئی اتحاد ممکن نہیں۔''

ارشاد ہوا ''ہندو قومیت کا وجود بھی برائے نام ہے۔ اگر آج ہندوؤں میں مہاراشٹر کی ...س کا خیال پیدا ہو رہا ہے تو آپ لوگ دیکھیے گا کل اتحاد بنگال کا مطالبہ ہوگا۔''[۳]

میں نے عرض کیا ''آپ کا ارشاد کیا یہ ہے کہ از روئے سیاست ہندوستان میں صرف مسلمانوں ہی کی حیثیت ایک قوم کی ہے؟''

فرمایا ''بے شک۔ ہندو ایک قوم نہیں ہے، بلکہ کئی ایک قوموں کا مجموعہ[۴] اتحاد ہند کا خیال بیرونی حملوں سے ڈر کا پیدا کردہ ہے۔ جب تک یہ ڈر باقی ہے اتحاد کی کوششیں جاری رہیں گی۔ لیکن جس طرح یورپ کا اتحاد بالآخر ٹوٹا، ہندوستان کی تقسیم بھی یقینی ہے۔ اکبر کی کوشش تھی کہ ہندوستان متحد ہو جائے، مگر اس سے اور زیادہ افتراق پیدا ہوا۔[۵] عالمگیر کو بھی اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔ ایک کوشش وطنی تھی، دوسری سیاسی۔''[۶]

پھر یورپ کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''میں بارہا کہہ چکا ہوں اس کی ابتدا لوتھر سے ہوئی۔ لوتھر کے ہاتھوں جب کلیسا کی سیادت ختم ہوئی تو اس سیاست کا بھی خاتمہ ہو گیا جس نے یورپ کو متحد کر رکھا تھا، لہٰذا قدرتی بات تھی کہ اقوام یورپ کو کسی نئی اساس سیاست کی جستجو ہوتی۔ اس جستجو نے ان کی توجہ وطن اور نسل کی طرف منتقل کر دی۔ آخر الامر زمین اور رنگ بنائے سیاست ٹھہری۔ یوں جغرافی قومیت اور وطنیت کا ظہور ہوا، قومیں اور ملک وجود میں آئے اور مذہب ایک امر ثانوی رہ گیا۔ لیکن قوموں اور ملکوں کا وجود جب ہی قائم رہتا کہ ان کی طاقت غ... نہ ہونے پاتی۔ لہٰذا اقوام یورپ برابر اس کوشش میں لگی رہیں کہ جس طرح بھی بن

۷- ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء۔

۸- جسے نسلیت اور جغرافی وطنیت پہلے ہی سے ہوا دے رہی تھی۔ حضرت علامہ نے لوتھر کی تحریک، اس کے سیاسی پہلو اور اہلِ مغرب کے اخلاق و معاشرت اور مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا اس کا تجزیہ جس خوبی سے کیا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہو ان کا عہد آفرین خطبۂ صدارت لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں، نیز ان کے مکتوبات، متفرق تحریریں اور کلام۔

- حضرت علامہ کے مرض کی ابتدا بھی سویوں میں دہی کے استعمال سے ہوئی۔

حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم حضرت علامہ کے احباب میں سے تھے۔ اسرار خودی کا پہلا نسخہ انھیں کے اہتمام سے شائع ہوا۔ حکیم صاحب مرحوم کو طب میں جو مہارت حاصل تھی اس کے علاوہ خطاطی کے بھی ماہر تھے۔ طبیعت کے بڑے شگفتہ، بڑے بذلہ سنج، بڑے وضعدار اور احباب نواز تھے۔ ان کی ذات بھی ایک انجمن تھی۔ وچھووالی میں مطب کرتے۔ ہندوؤں میں بھی بڑے ہردلعزیز تھے۔

سہ شنبہ: ۱۵ر فروری

حضرت علامہ فرماتے ہیں ''مرزا دین محمد کے دماغ میں فتور تھے۔ یہ شخص سمجھتا ہے اس کا تعلق ارواح سے تھے۔''

میں نے عرض کیا ''اب میں سمجھا کل آپ ان کی باتوں سے کیوں آزردہ خاطر ہو رہے تھے۔''

آج بھی میں چاشت سے پہلے ہی حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا۔ کئی باتیں مشورہ طلب تھیں۔ حضرت علامہ کا مزاج بفضلہٖ تعالیٰ نہایت شگفتہ ہے۔ مرزا دین محمد کے بارے میں ہنس ہنس کر گفتگو کرتے رہے: یہی دماغ کا فتور، ارواح سے تعلق، جنات کی تسخیر، نذر و نیاز، غرض کہ جملہ خرافات جو اس سلسلے میں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ پھر ذرا دم لے کر حقے کا کش لیا اور تکیے کے سہارے کمر ٹیک لی تو میں نے ذاتی معاملات کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمایا ''طلوع اسلام کا کیا ہوا؟''

میں نے عرض کیا ''شاید دہلی ہی سے شائع ہو۔''[1]

قدرے خاموشی رہی۔ حضرت علامہ چاہتے تھے طلوع اسلام لاہور سے شائع ہو، مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ ایسا کوئی امکان نہیں اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ لہٰذا گفتگو کا رنگ بدل گیا۔

حضرت علامہ نے عزیزی منیر کے تقرر پر مکرر اظہار مسرت فرمایا اور مستقبل کے بارے میں مزید تسلی دلائی۔

میں نے صحت کا پوچھا تو ارشاد ہوا ''دوا المسک کا استعمال شروع ہے۔ نیند البتہ بہت کم آتی ہے۔ جوشاندہ پیتا ہوں تو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔[2] دمہ رُک جاتا ہے۔''

ارشاد ہوا ''جناح نے مرزا محمود احمد[3] کا خط مجھے بھیج دیا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں: ہماری جماعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اگر آپ نے ہمیں لیگ میں شامل نہ کیا تو

مجبوراً کانگریس میں شمولیت کرنا پڑے گی۔"

میں نے عرض کیا "آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا "رائے کا کیا سوال ہے؟ لیگ میں شامل ہوں یا کانگریس میں، ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو جی چاہیں کریں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک ہم مسلمان مسلمان ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں اور انھیں بھی اسلام کا دعویٰ ہے تو پھر لیگ یا کانگریس میں شرکت اور عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں بہر حال لیگ میں شامل ہونا چاہیے۔ لیکن مرزا صاحب تو لیگ اور کانگریس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس اَمر کا ثبوت ہے کہ یا تو بحیثیت ایک جماعت وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں، یا ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے۔ میں نے بہر حال جناح کو لکھ دیا ہے کہ اس قسم کے خطوں کا کوئی جواب نہ دیں۔"

میں نے کہا "لاہوری جماعت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یہ جماعت تو ہماری تکفیر نہیں کرتی۔"

فرمایا "یہ ٹھیک ہے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک اس کا جرم یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو مسلمان، بلکہ بہتر مسلمان سمجھتی ہے جو مسلمانوں کی تکفیر کر رہے ہیں۔"[۴]

شہید گنج کی باتیں ہونے لگیں: ۱۹۳۵ کا ہنگامہ اور اب مسلمانوں کی خاموشی، بالخصوص مولانا ظفر علی خان کی۔ ہر کہیں گومگو کی سی حالت، ہندوؤں اور سکھوں کا احساس تفوق، پریوی کونسل میں اپیل کا ڈھونگ، یونینسٹ پارٹی کے ہتھکنڈے۔

میں نے عرض کیا "اگر مسلمان قانون شکنی پر آمادہ ہو جائیں اور ہمارے اربابِ سیاست قید و بند کی سختیاں گوارا کر لیں تو کیا اس سے ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کی آنکھیں نہیں کھل جائیں گی؟"

فرمایا "کیوں نہیں۔ میری رائے میں قانون شکنی ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ قانون شکنی کے نتائج قوم کے لیے نہایت اچھے ہوں گے۔ لیگ کو بھی اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ لیکن میں تو جناح کو یہی مشورہ دوں گا کہ قانون شکنی کی تحریک ہی ہماری یاس اور بے دلی کا واحد علاج ہے، بلکہ میری صحت نے اجازت دی تو میں خود بھی اس میں شرکت کروں گا۔"

قانون شکنی سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ خلافت کی ناکامی سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا اس پر اظہار افسوس ہونے لگا۔ اس تحریک کی ناکامی کا ایک بہت بڑا سبب تو یہ تھا کہ اس

میں اسی آیت کے بعد اس کی صراحت کی گئی ہے۔''[۱۳]

فرمایا ''تمھارا اشارہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی طرف ہے کہ اے اللہ! تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟''

میں نے عرض کیا ''جی ہاں اسی سوال کی طرف۔''

ارشاد ہوا ''اللہ تعالیٰ نے 'کیف' کا جواب 'صرھن' سے دیا اور 'صرھن' کا ترجمہ عام طور سے یہ کیا جاتا ہے کہ جانوروں کی تکہ بوٹی کردو۔ لیکن صرھن کے اس ترجمے سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی تکہ بوٹی کردی، ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا اور انھیں پکارا تو وہ دوڑتے ہوئے ان کے پاس آگئے 'کیف' کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہاں اگر صرھن کے معنی ہیں سدھانا، راہ پر لگانا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ 'کیف' کا جواب مل گیا۔[۱۴] فلسفیانہ ... سے بہر حال مسئلہ یہ ہے کہ جواہر کی وہ ترکیب جو عبارت ہے وجود انسانی سے کیا ایک دفعہ بکھر کر علی حالہ پھر بھی قائم ہوسکتی ہے؟ سائنس کا جواب اس سلسلے میں اگر مثبت نہیں تو منفی بھی نہیں ہے۔ اس کے امکان سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا۔''[۱۵]

میں نے عرض کیا ''لیکن اس میں ایک بات غور طلب ہے۔''

فرمایا ''کیا؟''

''یہ کہ خلق اول تو ایک حقیقت ہے[۱۶] انسان خود وجود میں آیا۔ دوسروں کو وجود میں آتا دیکھتا ہے۔ لیکن خلق آخر کا فہم نہایت مشکل ہے، جیسا کہ آپ نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے۔''[۱۷]

فرمایا ''کیسے؟''

''آپ کا ارشاد ہے قرآن پاک نے اس حقیقت کو مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے، مثلاً زمین کا مردہ ہوکر پھر روئیدگی حاصل کرنا۔ قرآن پاک نے یہ مثال پیش کی اور فرمایا: كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ۔[۱۸] لیکن سوال یہ ہے کہ یہ عمل کیسے اور کہاں رونما ہوتا ہے؟''

ارشاد ہوا ''حیاتی اعتبار سے تو ہم یہی کہیں گے کہ خلق اول کا عمل بطن مادر میں رونما ہوتا ہے۔ آگے چل کر عالمِ کائنات اس کا جولاں گاہ بنتا ہے۔[۱۹] پھر اس کے لیے موت ہے، ایک گوشۂ زمین اور جسم کا انحلال و انتشار۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وحدت قائم رہتی ہے، لہٰذا وہ ... صل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر بطن مادر کی طرح بطن مرقد میں بھی ایک عمل رونما ہوتا

چائے ختم ہوئی تو حضرت علامہ نے کچھ دیر آرام فرمایا، لیکن معلوم ہوتا ہے وحدت حیات کا خیال ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ ارشاد ہوا ''وحدت حیات کا تصور کتنا مشکل ہے۔ یہ اَمر کہ باوجود انفرادیت کے افراد کی مثال نفس واحدہ کی ہے، آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا[۳۴] اس کا سمجھنا بڑا دشوار ہے۔''[۳۵]

فرمایا ''برگساں نے اس وحدت کے پیشِ نظر افراد کے باہمی تعلق کو لاسلکی[۳۶] کے سے تعلق سے تعبیر کیا ہے۔''

میں نے عرض کیا ''یہ تشبیہ تو بڑی خوب ہے، لیکن برگساں کے متعلق ایک خیال یہ بھی تو ہے...... معلوم نہیں صحیح یا غلط...... کہ اس کا فکر خالصاً فلسفیانہ نہیں، بلکہ شاعرانہ بھی ہے۔''

ارشاد ہوا ''یہ خیال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ موجودہ زمانے میں وہی ایک شخص ہے جس نے حیاتی مباحث پر گہرا غور وفکر کیا ہے۔ یوں بھی قدرت نے ادائے مطلب کے لیے اسے ایک خاص ملکہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر بڑی شگفتہ اور ساحرانہ ہے۔ استعارہ تو اسے فوراً سوجھتا ہے۔ بہرکیف لاسلکی کی تشبیہ سے اسے یہ کہنا منظور ہے کہ انسان محض جسم نہیں جیسا کہ مادئین کا خیال ہے، نہ جسم سے محدود جیسا، کہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جسم نے ہماری ذات کے اردگرد جو حصار کھینچ رکھا ہے وہ اس کے تشخص کا اختیاری مظہر ہے۔''[۳۷]

میں نے کہا ''پیرس میں جب آپ نے برگساں سے ملاقات کی اور گفتگو ہوئی تو کیا اس کی کوئی یادداشت بھی لی گئی تھی؟''

فرمایا ''امراؤ سنگھ[۳۸] میرے ساتھ تھے۔ گفتگو بھی انھیں کے توسط سے ہوتی رہی اور انھی نے اسے قلم بند بھی کیا، مگر اس برے طریق سے کہ بعد میں انھیں خود بھی اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہوگیا۔''

ارشاد ہوا ''اس گفتگو میں برکلے کے متعلق بھی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ برکلے کی اہمیت موجودہ زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔''[۳۹]

پھر فرمایا ''اس گفتگو کا ملخص مشہور فن کار......[۴۰] کو بھیج دیا گیا تھا، معلوم نہیں وہ کہیں موجود بھی ہے یا ضائع ہوگیا۔''

میرے اس سوال پر کہ آپ نے برگساں سے کیا اپنے نظریۂ زمان کا ذکر بھی کیا تھا، فرمایا ''ہاں اس کا ذکر آیا تھا اور برگساں کو بھی بڑا افسوس تھا کہ میں نے اسے کیوں ضائع کردیا۔''[۴۱]

حواشی

۱- یعنی وہ مجلّہ جس کا اجرا راقم الحروف نے ۱۹۳۵ میں دہلی سے کیا اور جو ۱۹۳۶ میں لاہور منتقل ہوا، مگر جس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی۔

احبابِ دہلی کی کوشش تھی کہ اس مجلّے کا مکرر اجرا ہو۔ انھوں نے ایک مجلس سی قائم کی اور حکیم احمد شجاع صاحب کو لکھا کہ اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو فرمائیں۔ میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ متعدد نشستیں ہوئیں۔ بالآخر سلسلہ گفتگو ٹوٹ گیا۔ بنائے اختلاف اُصولی تھی۔ مجلس کی رائے تھی کہ پنجاب کے اربابِ اقتدار، یعنی یونینسٹ پارٹی کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے، اگر مجبوراً لکھنا بھی پڑے تو باحتیاط اور ہر طرح کی مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے اور ختم نبوت کا تو ذکر تک نہ آئے (حالانکہ یہ اس وقت کا خاص اور بڑا اہم مسئلہ تھا)، نہ قائداعظم کی حمایت کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جب اس کا پہلا پرچہ دہلی سے شائع ہوا تو اس کے دو مضامین ''لیگ پارلیمنٹری بورڈ'' اور ''ختم نبوت'' کے بارے میں کہیں اشارتاً، یعنی ذاتی گفتگوؤں میں اور کہیں صراحتاً، مثلاً روزنامہ انقلاب میں راقم الحروف کو مشورہ دیا گیا کہ نظر برحالات ان مسائل کو چھیڑنا خلاف مصلحت ہے۔ گویا دہلی سے لاہور آ کر مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ زبان سے لوگ کچھ بھی کہیں عملاً اربابِ اقتدار کے ساتھ ہیں۔ فضا ناسازگار تھی۔ میں نے طلوع اسلام بند کر دیا۔ حضرت علامہ کو بھی افسوس تھا۔

اس دوران میں پرویز صاحب بھی آزادانہ طلوع اسلام ہی کے نام سے اس مجلّے کی اشاعت کا اہتمام کر رہے تھے جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد دہلی سے شائع ہوا۔ لیکن یہ طلوع اسلام کا دورِ جدید نہیں تھا، بلکہ ایک نیا طلوع اسلام جو دہلی سے کراچی اور کراچی سے بالآخر لاہور منتقل ہو گیا اور اب تک شائع ہو رہا ہے۔

۲- گل گاؤزبان کے جوشاندے سے۔

۳- جو اس زمانے میں بڑی سرگرمی سے یہ کوشش کر رہے تھے کہ مذہبی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے اپنی جماعت کی الگ تھلگ حیثیت منوالیں۔

۴- لاہوری جماعت کا ایک طرف تو یہ کہنا تھا کہ اسے بحث ہے تو مرزا صاحب کے دعویٰ امامت، مہدویت اور مسیحیت سے وہ قادیانی تصورِ نبوت کو صحیح تسلیم نہیں کرتی لیکن اسے شکایت تھی کہ اگر قادیانی جماعت غیر تشریعی نبوت کی قائل ہے اور غلطی سے اس پر مصر تو مسلمان اسے کافر کیوں ٹھہراتے ہیں۔ اسلام اہلِ تکفیر کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ اہلِ قبلہ کا مکفر خود کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب وہ قادیانی

جماعت کو کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر کر رہی تھی مسلمان ہی سمجھتی تھی، بلکہ زیادہ بہتر مسلمان۔ اس لیے کہ قطعِ نظر اس غلو کے جو قادیانی جماعت کو مرزا صاحب کے دعووں میں تھا لاہوری جماعت کو اس سے اختلاف تھا تو یہ کہ مرزا صاحب امام وقت تو ہیں (دیکھیے رسالہ ضرورۃ الامام) لیکن امام وقت کے انکار سے اسلام کا انکار لازم نہیں آتا، گو ایمان میں کمی رہ جاتی ہے لہٰذا قادیانی اہلِ قبلہ ہیں مسلمان ان کی تکفیر نہ کریں۔ لیکن قادیانی جماعت مسلمانوں کی تکفیر کرتی اور اس کے باوجود لاہوری جماعت اسے مسلمان سمجھتی۔

۵- جس میں ان کے مخصوص مذہبی تصورات......ستیا گرہ اور اہنسا...... کام کر رہے تھے، لہٰذا خیال یہ تھا کہ اس تحریک کی روح غیر اسلامی ہے، چنانچہ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء میں یہ مسئلہ اکثر زیرِ بحث رہا کہ گاندھی جی کی 'نان کوآپریشن' کو کیا فی الواقع وہی حیثیت دی جا سکتی ہے جو اسلامی شریعت میں ترکِ موالات کو ہے۔ حالانکہ اس لحاظ سے یہ تحریک بلاشبہ ترکِ موالات کے اس تصور پر مبنی تھی جو از روے سورۂ ممتحنہ قائم ہوتا ہے اور جسے جمعیۃ العلماے ہند نے مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں اختیار کیا تھا۔ سورۂ ممتحنہ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی قوم مسلمانوں کی دشمن ہے تو اس سے موالات جائز نہیں۔ انگریز مسلمانوں سے دشمنی کر رہے تھے۔ لہٰذا ترکِ موالات کی اس تعبیر سے کسی مسلمان نے انکار نہیں کیا، نہ کر سکا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب رہنمایانِ خلافت کا ایک وفد، جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام بھی شامل تھے لاہور آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اربابِ اسلامیہ کالج حکومت سے ترکِ موالات کا اعلان کر دیں تو کالج کمیٹی کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس میں مولانا محمد علی نے اربابِ انجمن سے خطاب کرتے ہوئے ترکِ موالات کی تجویز پیش کی اور مولانا ابوالکلام نے ان کی تائید میں سورۂ ممتحنہ کی آیات کا حوالہ دیا۔ اس پر سر عبدالقادر نے مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کے حوالے سے سورۂ ممتحنہ کی اس تعبیر سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ قرآن مجید نے عیسائیوں کو مسلمان کا دوست کہا ہے اور انگریز عیسائی ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے یہ سنا تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور جوش میں آ کر کہنے لگے شیخ صاحب قرآن مجید کے ارشادات تو بالکل صاف اور واضح ہیں۔ ہم قرآن مجید کے پابند ہیں۔ مولوی نذیر احمد کا ترجمہ یا حواشی ہمارے لیے حجت نہیں ہیں۔ انگریز عیسائی ہیں تو ہوا کریں۔ کیا آپ کو ان کی اسلام دشمنی سے انکار ہے؟ حضرت علامہ بھی اس جلسے میں موجود تھے، لیکن انھوں نے شروع سے لے کر آخر تک سکوت فرمایا۔ مجھے تعجب تھا اور مجھ سے بڑھ کر علماے خلافت کو۔ لیکن آگے چل کر میں نے ان کے ارشادات سے محسوس کیا کہ انھیں اس تحریک سے اختلاف تھا تو اس بنا پر کہ اس کی زمام گاندھی جی کے ہاتھ میں ہے اور گاندھی جی کو سورۂ ممتحنہ کی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں۔ یوں بھی بانیانِ تحریک نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ قائم رہے گا۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر یہ اتحاد قائم نہ رہا تو نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی، ہندو مسلم اتحاد ٹوٹا اور مسلمان

میدان میں اکیلے رہ گئے۔ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہوتا چلا گیا، ہر طرف بے دلی پھیل گئی۔ لیکن ان حضرت علامہ کے برعکس ان دنوں معترضین جو کچھ کہہ رہے تھے مصلحتاً، یا اس خیال سے کہ حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ قادیانی جماعت اس تحریک کی مخالفت میں سب سے آگے تھی، حتیٰ کہ اس کی طرف سے ایک مبسوط رسالہ بھی شائع ہوا جس میں منجملہ کئی ایک دلائل کے اس تحریک کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دی گئی تھی کہ اس کی نوعیت سیاسی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ سیاست کی مثال تو دیوار قہقہہ کی ہے کہ جو کوئی اسے دیکھتا ہے ہنسنا شروع کر دیتا ہے اور ہنستا ہی رہتا ہے، لہٰذا جو کوئی سیاست میں حصہ لے گا سیاست ہی میں اُلجھا رہے گا۔ راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ اس رسالے کی یہ منطق آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی، نہ یہ کہ کسی تحریک کی مذہبی نوعیت کیا ہوتی ہے اور سیاسی کیا۔

۶- ہندو مسلم اتحاد، لیکن جس کی از روئے سیاست کوئی محکم بنیاد نہیں تھی، لہٰذا یہ اتحاد جس زور اور شدت سے قائم ہوا اسی زور اور شدت سے ٹوٹ بھی گیا۔

۷- ہندوؤں کے نزدیک یہ کہ اگر تحریک کامیاب ہوگئی اور حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لیے تو وہ غیر معمولی طور پر مضبوط ہو جائیں گے۔ انھیں خطرہ تھا کہ اس صورت میں اگر ان کے تعلقات اسلامی ممالک سے قائم ہوگئے تو ممکن ہے ہندوستان پر پھر اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ ادھر مسلمانوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر وہ تحریک جس کی قیادت گاندھی جی اور کانگریس کے ہاتھ میں ہے کامیاب ہوگئی تو ایسا نہ ہو ان کا وجود ہندوؤں میں ضم ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے کی سیاسی طاقت سے خائف تھے۔

۸- لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ -۱۰ (یونس): ۴۹۔

۹- اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرہ: ۲۵۹)۔

۱۰- قید بابل کے بعد-۵۹۹ ق م میں بخت نصر ارض فلسطین پر حملہ آور ہوا اور یہود پر فتح پائی۔ بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ہیکل سلیمانی کا وجود تک قائم نہ رہا، تا آنکہ ۵۳۹ ق م میں ہخامنشی سلطنت کے بانی کروش اعظم نے بابل فتح کیا۔ یہود کو اجازت ملی کہ فلسطین واپس چلے جائیں اور ہیکل مقدس از سر نو تعمیر کریں۔ یہ دوسری زندگی تھی جو بنی اسرائیل کو ملی۔ ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۴، ۵، ۶:
وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا۔

۱۱- اور ساری نوعِ انسانی کی تقدیر ان سے وابستہ۔

چہار شنبہ: ۱۶؍فروری

آج حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ حضرت علامہ حسبِ معمول آرام فرما رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا اور مزاج پوچھا تو معلوم ہوا انھیں ایک طرح سے میرا انتظار تھا۔ فرمایا ''تم آگئے؟ صبح مجھے پھر دمے کی شکایت ہوگئی۔''

میں نے یہ سنا تو بڑی تشویش ہوئی۔ حضرت علامہ نے پھر فرمایا ''کوئی بات نہیں۔ اللہ کے فضل سے اب اچھا ہوں۔''

حضرت علامہ کے اس ارشاد سے کچھ اطمینان ہوا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت دے کہ انھوں نے فرمایا ''کچھ خط رکھے ہیں۔ ان کا جواب دینا باقی ہے۔ جواب لکھ دو۔''

میں نے قلم دان اُٹھایا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ حضرت علامہ نے ایک ایک خط کا مختصراً جواب لکھوایا۔ کسی کا انگریزی، کسی کا اُردو میں۔ ان میں ایک خط مولانا حسین احمد مدنی کے ایک طرف دار کے نام تھا، ان کے اس نظریے کے بارے میں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔

خط لکھے گئے تو فرمایا ''حضرت طالوت[1] مولانا سے دریافت کریں، ان کے ارشاد کی حیثیت مشورے کی ہے، یا ایک اَمرِ واقعی کے اظہار کی۔''[2]

پھر ارشاد ہوا ''مولانا کے خیالات کے متعلق ایک پورا مضمون میرے ذہن میں ہے۔ کل اس کا قلم بند ہو جانا ضروری ہے۔ کسی وقت جاؤ اور قلم بند کر دو۔''

یہ کہہ کر حضرت علامہ بسبب اضمحلال لیٹ گئے۔ علی بخش نے تکیے سیدھے کیے۔ میں نے آگے بڑھ کر کاندھوں کو سہارا دیا اور خاموش بیٹھ گیا۔ گفتگو سے بھی قصداً احتراز کیا۔ دیر تک یونہی نشست رہی۔ حضرت علامہ کبھی کبھی کروٹ لیتے اور ایک آدھ بات کر لیتے۔ فرماتے: ہٹلر

جمعۃ المبارک: ۱۸ر فروری

دن بھر حاضری کا موقع نہیں ملا۔ شام کو حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچا تو انھیں بڑا متاسف پایا۔ صحت کا تو جو رنگ ہے سو ہے، حضرت علامہ کو دکھ اس بات کا ہے کہ مولانا حسین احمد کو اپنی غلطی پر اصرار ہے اور اب انھوں نے اپنے اس ارشاد کے علاوہ کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام میں قوم اور ملت[1] دو الگ الگ وجود ہیں۔

حضرت علامہ نے فرمایا ”اب تو مضمون لکھنا ضروری ہو گیا ہے۔“

پھر دیر تک مسلمانوں کے علمی زوال اور فقدان بصیرت پر اظہار تاسف فرماتے رہے۔

ارشاد ہوا ”یہ سیاست کا چکر بھی عجیب ہے۔ انگریزوں کی ضد میں کس طرح تلبیس حق بالباطل سے کام لیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ مسلمان کیوں نہیں سمجھتے اسلام کی اجتماعی روح کیا ہے؟ وہ عالم اور صوفی کیا ہوئے جو دین کے رمز شناس تھے؟“

فرمایا ”کیسے کیسے الفاظ ہیں جو لوگوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں! قوم، متحدہ قومیت، وطن، وطنیت، آزادی، خود اختیاری۔ لیکن کوئی نہیں سمجھتا آج کل کی سیاست میں ان کے معنی کیا ہیں؟“

ارشاد ہوا ”ان الفاظ کے معنوں کا متعین ہو جانا ضروری ہے۔ ان کا تجزیہ بھی ہو جانا چاہیے۔ یہ الفاظ عام ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے ان کو سمجھنے کی۔ لیکن مسلمانوں کو احساس ہی نہیں انھیں کس قسم کی جدوجہد درپیش ہے: از روے سیاست ہی نہیں، اخلاقاً اور ذہناً بھی۔ کاش مسلمان کوئی سیاسی فکر پیدا کریں۔“

حضرت علامہ دیر تک مسلمانوں کے ذہنی تعطل پر افسوس کرتے رہے۔ بیچ میں کچھ آرام فرما لیتے، پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے، حقے کا کش لیتے یا اپنے مخصوص انداز میں 'اللہ' کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علی بخش کو بلایا[2] اور چلم کی طرف اشارہ کیا۔ علی بخش نے چلم بدلی، کھانے

کا پوچھا اور پھر تھوڑی دیر میں کھانا لے آیا۔ حضرت علامہ نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ علی بخش اور رحما بدن دابنے لگے۔ م۔ش آ گئے تھے۔ پھر چودھری صاحب بھی تشریف لے آئے۔ حسبِ معمول مزاج پوچھا اور باتیں کرنے لگے۔ دوا کا وقت ہو گیا تھا۔ حضرت علامہ نے دوا کھائی۔ بچوں کا پوچھا کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کھانا کھا چکے؟ حکیم صاحب[۳] کب آئیں گے؟ سیاست کا کیا رنگ ہے؟ یونینسٹ پارٹی کیا کر رہی ہے؟ لیگ کس حال میں ہے؟

پھر جیسے کوئی خیال آیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور تکیے سے ٹیک لگا کر مجھ سے سوال کیا ''قوم اور ملت کے امتیاز پر اصرار کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟''

میں نے عرض کیا ''یہی کہ اس امتیاز کی کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن پاک سے دو الگ الگ اجتماعی نظامات کی موجودگی ثابت ہو جاتی ہے ایک قومی وجود ہوتا دوسرا ملی۔''

ارشاد ہوا ''یہ بحث کی نہایت اچھا پہلو ہے۔''

پھر فرمایا ''تاریخی اعتبار سے کیا اس سلسلے میں تم کوئی مواد جمع کر سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''بہت کافی۔ اجازت ہو تو اس سلسلے میں کچھ حوالے پیش کر دوں۔''

فرمایا ''مثلاً۔''

''مثلاً میثاقِ مدینہ، یعنی اس معاہدے کا جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری پر مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ سے کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں محفوظ ہے۔''

ارشاد ہوا ''اس میں خاص بات کیا ہے؟''

میں نے کہا، یہی کہ حضور نے مدینہ منورہ میں جس ریاست کی بنا ڈالی اس میں یہود کو شریک تو کر لیا لیکن اس کے باوجود انھیں ایک الگ قوم ٹھہرایا۔''

فرمایا ''اس معاہدے کی[۴] پوری نقل حاصل کر لو۔''

شنبہ: ۱۹ر فروری

میثاقِ مدینہ کی پوری نقل حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ فرمایا ''ترجمہ بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔''

دو پہر ہو چکی تھی۔ زیادہ تر وقت کتب خانے میں گزرا (پنجاب یونیورسٹی میں)۔

علی بخش آ گیا، حضرت علامہ کو دوا کھلائی اور ان کا بدن دابنے لگا۔ حضرت علامہ لیٹ گئے تا کہ ذرا
۔ میں ترجمہ کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ حضرت علامہ بڑے مضمحل ہیں، بیان کیسے لکھا جائے گا۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد حضرت علامہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ علی بخش نے چلم بدلی۔ ترجمہ ہو چکا تھا۔ میں نے کاغذات تپائی پر رکھ دیے۔ ارشاد ہوا ''مولانا حسین احمد یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ میثاقِ مدینہ ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ تعجب ہے انھوں نے اس پر غور نہیں کیا اور ایک غلط بات کہہ دی۔''

پھر ذرا ستا کر بیان کے بارے میں گفتگو شروع کر دی اور طرح طرح سے اظہار خیالات کرتے رہے، یہی کہ اسلام بنائے قومیت ہے اور اس کا سر چشمہ ہے رسالت،[۱] لہٰذا اسلام ایک سیاسی اجتماعی معاشرہ ہے۔[۲]

میں نے عرض کیا ''اس سیاسی اجتماعی معاشرے کو قرآن مجید نے اُمت سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ میثاقِ مدینہ میں لفظ اُمت استعمال ہوا ہے۔''[۳]

حضرت علامہ نے فرمایا ''مولانا عالم دین ہیں۔ اصطلاحات دینی سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں اُمت کے معنی کیا ہیں۔''

پھر فرمایا ''عجیب بات ہے۔ انھوں نے قوم اور ملت میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔''

حضرت علامہ نے یہ فرمایا تو ان کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آ گیا:

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا[۴]

حضرت علامہ کو نیند آ رہی تھی۔ میں نے کہا "آپ آرام فرمالیجیے۔ شام کو جلدی حاضر ہو جاؤں گا۔"

سرِ شام حاضر ہو گیا۔ حضرت علامہ کا اضمحلال دور تو نہیں ہوا تھا، لیکن معلوم ہوتا تھا طبیعت قدرے بہتر ہے۔ چودھری صاحب پہلے سے موجود تھے اور گفتگو وہی بیان کی تھی۔ اتنے میں راجا صاحب آ گئے اور پھر م۔ ش آ بیٹھے۔ حضرت علامہ میثاقِ مدینہ پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ فرمایا یہ جو ارشادِ باری تعالیٰ ہے: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس[۵] تو ثابت ہوا کہ اُمت کی بنا وطن کی بجائے عقیدے پر ہے اور عقیدے کا تقاضا تھا کہ حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم معظّمہ سے مدینۂ منورہ ہجرت فرمائیں۔[۶] میثاقِ مدینہ سے عملاً اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ فرمایا "مولانا حسین احمد کا فرض ہے کہ اسی اُصول کی بنا پر جو میثاقِ مدینہ میں قائم کیا گیا کانگریس سے مفاہمت کا مطالبہ کریں، بجائے یہ کہنے کے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔"

قریشی صاحب آ گئے۔ نبض دیکھی اور طبیعت کا پوچھا۔ علی بخش نے چائے کا اہتمام کیا اور تھوڑی دیر کے لیے گفتگو رُک گئی۔

اب ہم لوگ آپس ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ مطلب یہ تھا حضرت علامہ گفتگو نہ فرمائیں۔ مولانا حسین احمد کی موافقت اور مخالفت میں جو بیان نکل رہے ہیں، یا ان کے طرف داروں نے حضرت علامہ کے قطعے کو سامنے رکھتے ہوئے جواباً جس طرح طبع آزمائی کی اس کا ذکر ہوتا رہا۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا "کیوں نہ یہ مخالف و موافق بیانات جمع کر لیے جائیں تاکہ بیان کسی پہلو سے تشنہ نہ رہے۔"

چودھری صاحب نے کہا "یہ بیانات بآسانی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور کر لیے جائیں گے۔"

کچھ وقت اور گزرا۔ ہماری کوشش تھی حضرت علامہ کے ذہن پر بار نہ پڑے۔ بیان کا لکھنا بھی سرِدست ملتوی رہے۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے، دل ہلکا رکھنے کی۔ ورنہ ڈر تھا کہیں عوارض کی شدت میں اضافہ نہ ہو جائے۔

علی بخش کھانا لے آیا۔ حضرت علامہ نے کھانا کھایا، حقے کے دو ایک کش لیے اور پھر سہارے لیٹ گئے۔ علی بخش پاؤں دابنے لگا۔ قریشی صاحب ذرا آگے بڑھ گئے اور

یک شنبہ: ۲۰ر فروری

حسبِ ارشاد علی الصبح حاضر ہوگیا۔ چودھری صاحب تشریف فرما تھے اور جب تک دفتر کا وقت نہیں ہوگیا برابر بیٹھے حضرت علامہ کی ہدایات قلم بند کرتے رہے۔ معلوم ہوا قرشی صاحب نبض دیکھ گئے ہیں۔ حضرت علامہ کو اطمینان ہے۔

چودھری صاحب گئے تو حضرت علامہ نے فرمایا ''خبریں کیا ہیں؟''

میں نے عرض کیا، کوئی خاص خبر نہیں۔ پھر یہ کہ ''رات طبیعت کیسی رہی؟''

ارشاد ہوا ''عوارض کی تو وہی کیفیت ہے جو تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں، لیکن رات نیند ذرا کم آئی۔ صبح طبیعت مضمحل تھی، مگر دوا کھائی اور ناشتہ کیا تو اضمحلال جاتا رہا۔''

حضرت علامہ لیٹ گئے۔ مجھے تشویش تھی حضرت علامہ کے عوارض بڑھ تو نہیں رہے؟ ضعف و نقاہت کیوں ہے؟ نیند کیوں نہیں آتی؟

نیند کیوں نہیں آتی؟ نیند کیسے آسکتی ہے؟ م۔ش کہتے ہیں حضرت علامہ سوتے سوتے اکثر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ کہتے ہیں: مسلمانوں کو کیا ہوگیا؟ جو لوگ دین کے رازدار تھے وہی دین سے بے خبر ہیں۔ وہ بھی کہنے لگے ہیں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔

ادھر حضرت علامہ کے اضطراب اور اُمت کے لیے دل سوزی کی یہ کیفیت کہ سوتے جاگتے بس یہی ایک خیال ہے کہ اس مرحلے پر جب مسلمانوں کی موت و حیات کا سوال درپیش ہے، جب مسلمان غیر منظم اور غیر متحد ہیں، جب کفر و الحاد کا سیلاب تیزی سے بڑھ رہا ہے، مخالف قوتیں ان کے خلاف صف آرا ہیں اور وہ خود دین سے بے بہرہ، اگر کہیں علما نے بھی سیاست کی وہ تعبیر قبول کر لی جس کی بنا مادیت پر ہے اور جس سے ان کے سیاسی اور انجام کار جداگانہ قومی وجود کی نفی ہوجائے گی تو کیا ہوگا۔ اُدھر ان کے عوارض میں تخفیف کی بجائے شدت

دوشنبہ: ۲۱رفروری

ابھی سہ پہر نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اول علی بخش سے خیریت مزاج دریافت کی۔ معلوم ہوا طبیعت نسبتاً اچھی ہے۔ چودھری صاحب صبح سویرے ہی آگئے تھے۔ میں سمجھ گیا بیان ہی کی گفتگو ہوگی۔

کمرے میں داخل ہوا، سلام عرض کیا اور مزاج پوچھا۔ حضرت علامہ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ فرمایا ''تم آگئے؟ اچھا کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسلامی ریاست میں جب از روئے میثاقِ مدینہ مسلمان اپنی جگہ پر ایک اُمت تھے اور غیر مسلمان (یہود) اپنی جگہ پر ایک اُمت، گو شہریوں کی حیثیت سے حقوق اور فرائض میں سب ایک دوسرے کے شریک، تو مولانا حسین احمد کا بھی فرض تھا کہ اسی اُصول کو پیشِ نظر رکھتے۔ بنائے گفتگو ہوتی تو یہی اُصول، نہ کہ وطن اور قوم کا مغربی تصور۔''

ارشاد ہوا ''لیکن مولانا ہیں کہ اب قوم اور ملت کا امتیاز قائم کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان کے ارشاد کا تعلق قوم سے تھا، ملت سے نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ یہ امتیاز کیوں پیدا کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا کیا مطلب ہے؟''

فرمایا ''اسلام سے پہلے قوموں کی تشکیل جس اُصول پر ہو رہی تھی[۱] اسلام نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج بھی وہ اُصول جسے بنائے قومیت ٹھہرایا جاتا ہے ہمارے لیے قابلِ تسلیم نہیں۔[۲] ہماری بحث کا تعلق بھی اسی اُصولِ قومیت سے ہے۔ ہمیں تو قومیت کے اس جدید تصور سے اختلاف ہے جو مغرب کے سیاسی فکر کی پیداوار ہے اور جس کا آغاز لوتھر کی تحریک سے ہوا۔''[۳]

ارشاد ہوا ''یہ تصور سرتاسر کفر ہے۔[۴] مگر افسوس ہے مولانا ہر روز ایک نئی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ اب وہ لغت کا سہارا لے رہے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں قوم اور ملت میں فرق کریں۔

حالانکہ یہ مسئلہ لغت کا نہیں، قرآن پاک کی تعلیمات کا ہے۔"

حضرت علامہ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ پھر فرمایا "قرآن پاک نے لفظ قوم کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟ تم اس سوال کے جواب میں کیا کہو گے؟"

میں نے عرض کیا "یہی کہ مولانا نے عربی لغت کی رُو سے قوم کے جو معنی متعین کیے ہیں اور فرمایا ہے کہ قوم عبارت ہے افراد کی کسی جماعت سے، حتیٰ کہ اگر ان کی تعداد صرف دو ہے (اور دونوں مرد ہیں) جب بھی انھیں قوم ہی کہا جائے گا اس سے ان کا نقطۂ نظر واضح نہیں ہوتا۔ قرآن پاک کی رُو سے تو اس لفظ کا جو مفہوم ہمارے سامنے آتا ہے یہ کہ قوم عبارت ہے افراد کے اس گروہ سے جن میں کوئی بات مشترک ہو۔ خواہ مستقلاً، خواہ ہنگامی طور پر، خواہ یہ اشتراک قولی ہو، خواہ فعلی۔ مثلاً اہلِ علم ایک قوم ہیں، اہلِ عقل ایک قوم اور اہلِ کفر بھی ایک قوم۔ گو اہلِ کفر میں ایک نہیں کئی مختلف العقیدہ لوگ شامل ہوں گے، لیکن بمقابلۂ اہلِ ایمان ان سب کو ایک ہی قوم تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ سیاسی اعتبار سے بھی اہلِ علم، یا اہلِ عقل، یا اہلِ کفر ایک ہی قوم ہوں۔ چنانچہ قرآن مجید میں جب ارشاد ہوتا ہے: قَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ یا قَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ، تو اس سے جو مطلب نکلتا ہے یہ کہ قوم کے ایک وہ معنی بھی ہیں جو قرآن مجید نے لغت سے ہٹ کر اختیار کیے ہیں۔ اس اعتبار سے قوم کوئی مخصوص اصطلاح نہیں۔ البتہ اگر اصطلاحاً قوم عبارت ہے کسی سیاسی اجتماع سے تو قرآن مجید نے اس قسم کی گروہ بندی کو اُمت سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا قوم اور ملت کا امتیاز پیدا کرنا غلط ہے۔ یوں بھی ملت کا اشارہ اس اُصول زندگی کی طرف ہے جسے قبول کرتے ہوئے لوگ ایک اُمت یا یوں کہیے کہ سیاسی اصطلاح میں قوم بنتے ہیں۔"

ارشاد ہوا "تو پھر مولانا کو چاہیے لغت کا سہارا نہ ڈھونڈیں، انھیں چاہیے اس اَمر پر نظر رکھیں کہ قرآن پاک نے اگر کسی لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تو کن معنوں میں۔ یہ نہیں کہ خود اپنی طرف سے اس کا معنی و مفہوم متعین کرنے کی کوشش کریں۔ مولانا اور ان کے حامیوں کا یہ خیال بہر صورت غلط ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ وطن بھی قومیت کی کوئی مستقل اساس نہیں ہے۔"[۵]

قاہرہ سے ایک خط آیا رکھا تھا۔ ارشاد ہوا "اسے پڑھو۔"

میں نے خط اُٹھایا تو دیکھا کہ لکھنے والے کوئی صاحب ہیں ابو نصر احمد بھوپالی۔ مضمون یہ تھا کہ میں نے آپ کی شاعری اور فلسفہ کے موضوع پر عربی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کی

صاحب نے قوم اور ملت کی بحث چھیڑ دی۔ ان کا ذہن بھی مولانا حسین احمد کے تازہ بیان سے متاثر تھا۔ وہ شاید آئے ہی اسی موضوع پر گفتگو کے لیے تھے۔

میکش صاحب نے کہا ''کیا قوم اور ملت کا وجود الگ الگ ہے؟''

حضرت علامہ نے فرمایا ''فرض کیجیے قوم کا وجود ملت سے الگ ہے جب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک قوم یا بحیثیت ایک ملت [۱۰] ہندوستان کے آئینی ارتقا میں ہم اپنا مفاد کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں؟''

میکش صاحب کہنے لگے ''آپ تو قوم کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کے نزدیک حقیقی وجود ملت کا ہے۔''

ارشاد ہوا ''میں وطنی قومیت کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔ وطنی قومیت کا تصور اسلام کے خلاف ہے۔''

میکش صاحب نے کہا ''اگر یہ صحیح ہے تو اسلام کا مطالبہ بڑا سخت ہے۔''

فرمایا ''اس کے سخت ہونے میں کلام نہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسلام کا مطالبہ بہر حال یہی ہے۔''

اس پر میکش صاحب بولے ''اندریں صورت دوسری قوموں سے تعاون کیسے ہوگا؟''

ارشاد ہوا ''ان ہی شرائط پر جو اسلام نے قائم کی ہیں۔ [۱۱] اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ یہی نمونہ خلفا کے سامنے تھا۔''

میکش صاحب تھوڑی دیر اور بیٹھے۔ پھر تشریف لے گئے۔ معلوم ہوتا تھا وہ حضرت علامہ کے ارشادات سے مطمئن ہیں۔ حضرت علامہ نے کھانا کھایا۔ علی بخش اور رحما آ گئے۔ اب حضرت علامہ کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ حضرت علامہ کبھی کبھی کوئی بات کرتے یا حقے کا کش لگاتے اور میں جواباً کچھ عرض کر دیتا۔ سات سوا سات بجے احباب کی آمد شروع ہوگئی۔ حضرت علامہ کا مزاج بھی شگفتہ ہو رہا تھا۔ البتہ دس، ساڑھے دس بجے انھوں نے قرشی صاحب کا تجویز کردہ جوشاندہ پیا تو اس میں قدرے ترشی محسوس کی۔ سوال یہ تھا ترشی کہاں سے آئی؟ جوشاندہ ابریشم مقرض کا تھا۔ ابریشم میں تو ترشی نہیں ہوتی۔ ترشی تو حضرت علامہ کے لیے سخت مضر تھی۔ حضرت علامہ جوشاندے کا ایک گھونٹ پی کر رُک گئے تو میں نے عرض کیا دریافت طلب اَمر یہ ہے کیا ابریشم کو کاٹ کر صاف کر لیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر نہیں کیا گیا تو

جوشاندہ نہ پیجیے۔ مگر اس کے باوجود حضرت علامہ جوشاندہ پی گئے، اس لیے دیر تک تشویش رہی کہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

حواشی

۱- نسلی، وطنی، قبائلی اساس پر۔

۲- وطنی قومیت کا۔

۳- دیکھیے خطبۂ الہ آباد۔

۴- کیونکہ اس کی بنا مادیت پر ہے۔

۵- اس لیے کہ جدید اُصولِ سیاست کی رُو سے ایک ہی وطن میں متعدد ریاستیں قائم ہوسکتی ہیں۔

۶- شیخ مصطفیٰ المراغی مرحوم، اس زمانے میں شیخ الازہر۔

۷- آقای مرتضیٰ احمد خان میکش درانی مرحوم۔ بڑے مخلص، سرگرم اور بے ریا کارکن اور صحافی، تحریکِ خلافت اور آزادی کے پرجوش مجاہد۔ تحریکِ ترکِ موالات میں کالج چھوڑا۔ پھر بسلسلۂ ہجرت کابل چلے گئے۔ واپس آئے تو صحافت کی زندگی اختیار کرلی۔ انقلاب زمیندار اور کئی دوسرے اخباروں میں کام کیا، جن میں روزنامہ احسان بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ انصاف کے نام سے ایک روزنامہ بھی نکالتے تھے۔ ۱۹۲۸ میں ایک فارسی ہفت روزہ افغانستان جاری کیا۔ امان اللہ خان مرحوم کے پرزور حامی تھے۔ نادر شاہ شہید کے شدید مخالف۔ چنانچہ اس مخالفت کی پاداش میں انگریزی حکومت نے انھیں قید کی سزا بھی دی۔ ۱۹۳۶ء میں جب حضرت علامہ نے قائداعظم کی حمایت میں پانچ ارکان پر مشتمل پنجاب مسلم لیگ کی ایک جماعت قائم کی تو اس کے ایک رکن میکش مرحوم بھی تھے۔ میکش صاحب کی کچھ تصنیفات اور رسائل بھی ہیں۔ تقسیم سے قبل احسان سے علیحدگی اختیار کرلی اور روزنامہ شہباز جاری کیا۔ وجہ یہ تھی کہ روزنامہ احسان انھیں یونینسٹ پارٹی کی حمایت پر مجبور کررہا تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے خلاف انھوں نے بہ کثرت مضامین لکھے اور مودودی صاحب سے بھی سلسلۂ نزع جاری رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد دیر تک صحافت سے وابستہ رہے۔ بالآخر خانہ نشین ہوگئے اور اپنا زیادہ تر وقت علمی اور ادبی سرگرمیوں میں صرف کرنے لگے۔

۸- محمد نادر خاں، شاہ افغانستان۔ میکش صاحب کا شروع ہی سے یہ دعویٰ تھا کہ شاہ شہید انگریزوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔

۹- جس میں بسبب غلامی ومحکومی ہر روز ایک نیا فتنہ پیدا ہوتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری سیاسی اور مذہبی جدوجہد میں جو عوامل کام کررہے ہیں ان کے پیشِ نظر افراد کی نیتوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے۔ ہمارے ذرائع محدود ہیں۔ خبر رساں ادارے غیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ ہم کیا ہیں؟ حسن ظن سے کام لیں یا سوئے ظن سے؟ لیکن مولانا روم کہتے ہیں اور بمصداق ان بعض الظن اثم کیا خوب کہتے ہیں:

بگذر از ظن و گمان اے بدگمان ان بعض الظن اثم ہم بخواں

۱۰- بمعنی اُمت۔

۱۱- سورۂ ممتحنہ میں اور جیسا کہ راقم الحروف اس سے پہلے عرض کر آیا ہے کہ سر عبدالقادر مرحوم نے اس سلسلے میں جو اعتراض اُٹھایا تھا، مولانا ابوالکلام نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا تھا: ہمارے لیے قرآن پاک حجت ہے نہ کہ اس کا ترجمہ اور تفسیر۔

بہتر ہوگا اس اعتراض کو ذرا واضح طور پر بیان کردیا جائے۔ یہ ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ حبیبیہ ہال سے دائیں جانب پہلے کمرے میں اربابِ انجمن (حمایت اسلام) جمع ہیں۔ ان کے سامنے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام اور ان کے ہمراہیوں میں سے چند اور حضرات بیٹھے ہیں۔ حضرت علامہ بھی تشریف فرما ہیں۔ گفتگو کا آغاز مولانا محمد علی کے خطاب سے ہوتا ہے۔ وہ جنگ عظیم میں انگریزوں کی عہد شکنی اور خلافت کا ذکر چھیڑتے ہیں اور ترکِ موالات کی قرارداد پیش کرتے ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ کالج حکومت سے قطع تعلق کرلے۔ اس پر سلسلۂ بحث شروع ہوجاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ کیا جارہا ہے گاندھی جی کے اشارے سے یا بربنائے شریعت؟ مولانا محمد علی کہتے ہیں ہماری تحریک شریعت پر مبنی ہے اور سورۂ ممتحنہ کی آیات سے اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔ لیکن سر عبدالقادر کہتے ہیں اہلِ کتاب سے تو ترکِ موالات جائز نہیں، انگریز اہلِ کتاب ہیں۔ مولانا پوچھتے ہیں یہ اہلِ کتاب کا استثنا آپ نے کہاں سے اور کیسے پیدا کرلیا؟ سر عبدالقادر قرآن مجید کا نسخہ ہاتھ میں لیے بعض آیات کے ترجمے اور حواشی کو اپنی تائید میں پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن مولانا ابوالکلام انھیں یہ کہہ کر خاموش کردیتے ہیں ''ہمارے لیے صرف قرآن پاک حجت ہے، کوئی ترجمہ یا تفسیر یا حاشیہ حجت نہیں ہے، خواہ کسی کا ہو۔'' آیات براۃ زیر بحث آجاتی ہیں۔ اعتراض اُٹھایا جاتا ہے کہ مشرکین سے موالات جائز نہیں۔ برعکس اس کے انگریز عیسائی ہیں اور عیسائی محبت ومؤدت میں بہ نسبت دوسروں کے مسلمانوں سے اقرب۔ اس پر مولانا محمد علی برافروختہ ہوکر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ''قرآن مجید کے احکام نہایت واضح ہیں۔ جس طرح سورۂ ممتحنہ نے موالات اور عدم موالات کا فیصلہ نہایت واضح طور پر کردیا ہے،

232

سہ شنبہ: ۲۲/فروری

صبح سے کوشش تھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں جلد سے جلد حاضر ہوسکوں مگر اس کے باوجود جاوید منزل پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ حضرت علامہ کی طبیعت ویسے تو بہتر ہے، نیند البتہ کم آتی ہے۔ فرمایا ''قرشی صاحب کی رائے ہے سر میں روغن لبوب سبع کی مالش ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ کوئی منوم دوا تجویز کر گئے ہیں۔'' ارشاد ہوا ''حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں جلد عوارض کا حال لکھ دیا گیا ہے۔ خدا کرے ان کی دوائیں جلد آ جائیں۔''

فرمایا ''دمے کی تکلیف کچھ بڑھ گئی ہے میں نے ڈاکٹر جمعیت سنگھ کو بلوایا تھا۔ وہ کچھ دوائیں تجویز کر گئے ہیں۔ امید ہے ان کے استعمال سے فائدہ ہوگا۔''

فرمایا ''انصاری[1] میں مولانا حسین احمد نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں ایک طرح سے ہمیں پھر مناظرے کی دعوت دی ہے۔ فرماتے ہیں اگر اسلام میں بنائے معاشرہ فرد کا شرف ذات ہے اور مقصد اتحاد انسانی تو قرآن پاک سے اس کی نص پیش کی جائے۔''[2]

میں نے کہا ''تعجب ہے مولانا محض ضد میں آ کر اس قسم کی باتیں ارشاد فرما رہے ہیں۔''

ارشاد ہوا ''اب کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے، انھیں کون سمجھائے؟'' اور یہ کہتے کہتے ان کا چہرہ متکدر ہو گیا۔

حضرت علامہ کو کانگریسی خیال علما کی سیاسی روش سے بڑا دکھ ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے نیند نہ آنے کی۔

حضرت علامہ کا مزاج بڑا مکدر تھا۔ سانس کی تکلیف ہونے لگی تو انھوں نے مجبوراً تکیوں پر سر رکھ دیا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہے، پھر ذرا آرام ملا تو لیٹ گئے۔ بے چینی کی سی کیفیت تھی اور جسے دیکھ کر میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ حضرت علامہ کبھی کروٹ بدلتے، کبھی اس حالت

ارشاد ہوا ''یہی تو اس کی شان بے نیازی ہے اور یہی مرحلہ ہے ایمان کا لیکن اس حقیقت کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا ان مراحل سے گزر ہو۔ ان میں جو بھی مشکل ہے ہمارے لیے ہے، ان کے لیے نہیں جو ان سے گزر رہے ہیں۔ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جہاں رب العالمین ہے وہاں اپنے بندوں پر غالب اور قاہر بھی۔[۵]

چند منٹ خاموشی رہی۔ حضرت علامہ خاموش لیٹے نامعلوم کیا سوچ رہے تھے کہ پاس کے کمرے سے بانو[۶] آئی اور حضرت علامہ سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی ''اباجی! آج نیازی صاحب ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔''

حضرت علامہ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا ''تمھیں بانو کی دعوت قبول کرلینی چاہیے۔''

میں نے عرض کیا، جیسے آپ کا ارشاد ہو۔ اور پھر تھوڑی دیر کے لیے کھانے کے کمرے میں چلا گیا جہاں جاوید، ان کی گورنس اور م۔ش منتظر تھے۔ کھانا کھایا اور چند منٹ بیٹھ کر پھر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس اثنا میں حضرت علامہ بھی کھانا تناول فرما چکے تھے۔ علی بخش چلم بدل کر حقہ سامنے رکھا تو فرمایا ''تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا مضمون ضرور ہونا چاہیے؟''

میں نے عرض کیا ''ضرور اور آپ ہی کی طرف سے۔''

فرمایا ''کیوں؟''

میں نے کہا ''اس لیے کہ کانگریسی خیال مسلمان الحاد اور لادینی کی جس دعوت کو دانستہ یا نادانستہ تقویت پہنچا رہے ہیں وہ روز بروز ترقی پر ہے۔ میں ان کے نظریات سے خوب واقف ہوں۔ پڑھا لکھا طبقہ تو خیر قرآن و حدیث سے دور ہٹ چکا ہے اور سمجھتا ہے وطنی قومیت سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ رہے عوام سو ان میں کانگریسی خیال علما کے زیر اثر اب یہ تحریک پھیل رہی ہے کہ وطنی قومیت کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ غیر کانگریسی علما میں کون ہے جو انھیں سمجھائے کہ جن سیاسی اور اجتماعی حقائق کے پیشِ نظر یہ تحریک پھیلائی جارہی ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے اور بطور ایک نظام مدنیت اسلام کی تعلیمات کیا۔ اگر آپ بھی خاموش رہے تو ان مغالطوں کا ازالہ کیسے ہوگا جو اس باب میں پیدا ہو چکے ہیں۔ کانگریسی خیال اخبارات کو دیکھ لیجیے، مولانا حسین احمد کی حمایت میں کس طرح مضمون پر مضمون لکھا جارہا ہے۔ لیکن ہمارے اخبار خاموش ہیں۔ آپ کا یہ مضمون شائع ہوگیا تو مجھے یقین ہے ویسا ہی مؤثر ثابت ہوگا جیسے

اسلام اور احمدیت۔''[۷]

فرمایا: ''بہت اچھا۔ چودھری صاحب کو آ جانے دو۔''

نو بج گئے۔ چودھری صاحب آ گئے تو ان سے پھر مضمون کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ چودھری صاحب نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''بہت اچھا۔ اگر رائے یہی ہے تو اس اُمر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مضمون دو ایک روز ہی میں قلم بند ہو جائے۔''

پھر ارشاد ہوا ''تمھارے پاس کیا وہ رباعی محفوظ ہے جو میں نے کچھ دن ہوئے مولانا کے بارے میں لکھوائی تھی۔''

میں نے عرض کیا ''جی ہاں محفوظ ہے۔''

ارشاد ہوا ''اس رباعی کی تصحیح کر دو۔ میں نے شروع کے دو مصرعے یوں بدل دیے ہیں:[۸]

میں نے بیاض اُٹھائی اور تعمیل ارشاد کر دی۔ حضرت علامہ نے رباعی سنی اور اطمینان ظاہر فرمایا تو بیاض الماری میں رکھ کر میں پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ حضرت علامہ نے رباعی میں جو اصلاح فرمائی نہایت مناسب تھی۔ پہلی صورت میں حضرت علامہ جو کہنا چاہتے تھے اس کا اظہار کے دو مصرعوں میں ہوتا تھا۔ اب ان کا مافی الضمیر واضح تھا اور آخری دو مصرعے ان کے دعوے کی دلیل۔ پورا قطعہ یا رباعی ارمغان حجاز میں موجود ہے۔

قریشی صاحب آ گئے، راجا صاحب کا انتظار تھا دیر تک نشست رہی۔

حواشی

۱- دہلی کا سہ روزہ اخبار۔ کانگریسی سیاست کا حامی اور بڑی حد تک جمعیت العلمائے ہند (کانگریسی) کا ترجمان۔

۲- ملاحظہ ہو تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، خطبہ ششم، بحث ریاست۔

۳- تشکیل جدید فقہ اسلامی، ایک نامعلوم پیغمبر کا صحیفہ، مقدمۂ قرآن مجید اور، صلور اسرافیل

وغیرہ وغیرہ۔

۴- پیام مشرق میں: نامۂ عالم گیر بہ پسر خود کہ بہ مرگ پدر دعا می کرد۔

۵- **هُوَالْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ**۔ ٦ (الانعام): ١٨، ٦١۔ اسے اپنے بندوں پر ہر طرح سے غلبہ حاصل ہے۔ وہی ان کا محافظ ہے۔ قہر کے اصل معنوں، نہ کہ ان معنوں میں جو اُردو میں رائج ہیں۔

۶- حضرت علامہ کی صاحبزادی۔

۷- یعنی وہ طویل بیان جو کتابی شکل میں بعنوان اسلام اور احمدیت شائع ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں لکھا گیا۔

۸- پہلے یہ دو مصرعے یوں تھے:

ندانی نکتۂ دین عرب را .... کہ گفتی روز روشن تیرہ شب را

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را ندانہ نکتۂ دین عرب را

شنبہ: ۲۶ رفروری

صبح وشام نشست رہی۔ چودھری صاحب، راجا صاحب، م۔ش اور قرشی صاحب سب ہی موجود تھے، لیکن صرف خبر گیری اور تیمارداری کے خیال سے، یا اس لیے کہ حضرت علامہ کا دل بہلائیں، ان کے لیے آرام اور سکون کا سامان پیدا کریں۔

ڈاکٹر جمیعت سنگھ جو دوا تجویز کر گئے تھے، جاری ہے۔ لیکن فائدہ ہے بھی تو بہت کم۔ ادھر حیدر آباد سے خط آیا، نہ دوائیں آئیں۔ زیادہ تر تکلیف دمے کی ہے اور یہ امر بڑا تشویشناک ہے۔ نیند بھی نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب شاید کوئی منوم دوا تجویز کریں گے، لیکن قرشی صاحب منوم دواؤں کے خلاف ہیں۔ وہ اپنے طور پر کچھ تدابیر کر رہے ہیں اور حضرت علامہ کا بھی اصرار ہے کہ ایلو پیتھک دواؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی مرشہ یا جوارش تجویز ہوتی رہے۔ لیکن یہ علاج در علاج کا معاملہ ٹھیک نہیں۔

حضرت علامہ نے مضمون کا پوچھا تو عرض کیا گیا ''آپ کی طبیعت ان شاء اللہ دو ایک روز میں سنبھل جائے گی، پھر مضمون بھی ہو جائے گا۔''

فرمایا ''بہت بہتر۔'' پھر ارشاد ہوا ''علما مداہنت سے کام لے رہے ہیں، حالانکہ ان کا کام تھا اُمت کی رہنمائی۔ یہ صورتِ حال بڑی افسوس ناک ہے۔''

فرمایا ''کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟''

چودھری صاحب نے مختصراً صورتِ حالات بیان کی۔ پنجاب کا ذکر آ گیا۔ ارشاد ہوا ''سارا معاملہ پنجاب کے زمینداروں کا ہے۔ پنجاب کے زمیندار کب سمجھیں گے؟ انھیں کب احساس ہوگا یونینسٹ پارٹی کی سیاست بڑی ناقص ہے۔''

ہم نے بات کو طول نہیں دیا۔ حضرت علامہ کا اشارہ شاید اس اَمر کی طرف تھا کہ سیاسی

اعتبار سے جب یہ طے ہے کہ زمینداروں کا یہ ٹولہ جسے یونینسٹ پارٹی کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ ہندوؤں اور سکھوں کی امداد اور تعاون کا محتاج رہے گا تو یہ بھی ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ محتاجی ان کے انفرادی مفاد کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے۔ اسے اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، یا محض معاشی فلاح و بہبود ہی کے خیال سے، ان کی رجعت پسندی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لہٰذا کوئی بھی نقطۂ نظر ہو اسلامی یا محض معاشی سوال یہ تھا کہ پنجاب کا زمیندار کب سمجھے گا زندگی صرف فصل کی کاشت اور غور و پرداخت نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ بہر حال نہیں ہے کہ انسان کی توجہ عمر بھر زمین پر مرتکز رہے اور مذہب و سیاست کی طرح علم و حکمت سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ جیسے بجز کاشت کاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ بقول حضرت علامہ پنجاب کا زمیندار زمین میں دانہ ڈالنے کے لیے تو بیتاب رہتا ہے لیکن اس کی خاک بدن دل کے دانے سے محروم ہے۔ لہٰذا ان کا ارشاد ہے:

بخاک بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں[1]

حواشی

۱۔ ضرب کلیم: پنجاب کے زمینداروں سے۔

چہار شنبہ: ۲ر مارچ

حضرت علامہ کی طبیعت بفضلہٖ تعالیٰ بہتر ہے۔ میں بسبب مصروفیت گو سہ پہر سے پہلے حاضر خدمت نہیں ہوسکا، لیکن قریشی صاحب سے مل لیا تھا۔ وہ ایک گونہ مطمئن تھے۔ میں نے جب حضرت علامہ سے معذرت کرتے ہوئے کہ حاضری میں دیر ہوگئی مزاج پوچھا تو انھوں نے بھی اظہار اطمینان فرمایا۔ ارشاد ہوا ''قریشی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو تسلی ہے۔''

مجھے صبح حاضر خدمت ہونا چاہیے تھا صبح حاضر خدمت نہیں ہوسکا لیکن حضرت علامہ کو معلوم تھا میری مصروفیتیں کیا ہیں۔ فرمایا ''طلوع اسلام کا کیا ہوا؟''

میں نے صورتِ حالات بیان کی تو فرمایا ''ابھی اور انتظار کرو۔ عجلت کی کیا ضرورت ہے؟''[1]

چندے خاموشی رہی۔ میں چاہتا تھا حتی الوسع کوئی بات نہ کروں۔ حضرت علامہ البتہ مولانا حسین احمد اور کانگریسی خیال علما کی اس روش پر افسوس فرماتے رہے جو انھوں نے سیاست میں اختیار کر رکھی ہے اور وہ بھی محض انگریز دشمنی کی بنا پر۔ ارشاد ہوا ''یہ لوگ جذبات کی رَو میں بہہ رہے ہیں۔''

پھر فرمایا ''مسلمانوں میں ایک افرنگ زدہ طبقہ پیدا ہوگیا تھا۔ بظاہر اب یہی طبقہ اسلام کی طرف لوٹ رہا ہے۔''

فرمایا ''یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوٹ اور پتلون کے مقابلے میں جسے گویا دہریت کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب سیاست اور تمدن کے وہ افرنگی تصورات جو اسلام کی ضد ہیں جبہ اور دستار میں پناہ لے رہے ہیں۔''

میں نے عرض کیا ''آپ نے خود ہی تو فرمایا ہے:

شوخی باطل ببیں اندر کمین حق نشست

جمعرات: ۳۰ / مارچ

میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ قریشی صاحب کہتے ہیں حضرت علامہ کی حالت بڑی تشویش انگیز ہے، بلکہ خطرناک۔ ایلو پیتھک دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ رات منوم دوا نے تو ایسا خراب اثر کیا کہ حضرت علامہ پر غشی کی سی حالت طاری ہوگئی اور وہ بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ اس وقت شاید چار کا عمل ہوگا۔ علی بخش تو گویا ہر وقت حضرت علامہ کی چار پائی سے لگا رہتا ہے۔ خیریت ہوئی کہ وہ اس وقت کمرے ہی میں موجود تھا۔ اس نے گھبرا کر م۔ ش کو پکارا اور پھر دونوں نے بڑی پریشانی کی حالت میں حضرت علامہ کو پلنگ پر لٹایا، مگر گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ نہ تو علی بخش کو خیال آیا، نہ م۔ ش کو کہ قریشی صاحب کو اطلاع کریں، یا ڈاکٹر صاحبان میں کسی کو بلالیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ قریشی صاحب اس روز خلاف معمول سیر سے پہلے ہی جاوید منزل آگئے۔ انھوں نے حضرت علامہ کی حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ پھر جو بھی تدبیر بن پڑی کی۔ حضرت علامہ پر اول تو دیر تک دوا کا اثر رہا۔ پھر جب ہوش آیا اور قریشی صاحب کو موجود پایا تو انھیں بڑا اطمینان ہوا۔ قریشی صاحب بھی جب تک حضرت علامہ کی طبیعت نہیں سنبھلی اور انھیں اطمینان نہیں ہوگیا حضرت علامہ کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ پھر بجائے سیر کے سیدھے میرے ہاں تشریف لے آئے۔ مجھے ان کی تشریف آوری پر بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا، یہ وقت تو آپ کی سیر کا تھا۔ ادھر کیسے آنا ہوا؟

دراصل میں اندازہ ہی نہیں کرسکا تھا کہ قریشی صاحب کے چہرے سے تشویش کے آثار نمایاں ہیں۔ انھوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "آپ فوراً جاوید منزل چلے جایئے۔ ڈاکٹر صاحب کی حالت بڑی خراب ہے۔ قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہیں۔ ایلو پیتھک دوائیں بھی راس نہیں آئیں۔ ضیق کی وجہ ہے فعل قلب کا نقصان۔ ہمیں سب سے زیادہ خیال قلب کا ہے۔"

قریشی صاحب نے کہا آپ کی نبض تو بسبب علالت کے سست ہے لیکن نبض کی تیزی اور سستی ایک طبعی اَمر ہے۔ چنانچہ آخر شب میں تندرست سے تندرست آدمی کی نبض بھی ضعیف ہو جاتی ہے، یہ قانون فطرت ہے۔ اس پر حضرت علامہ نے حقے کا کش لیتے ہوئے فرمایا ''اب میں سمجھا...... صاحب کو پچھلی رات میں کیوں الہام ہوا کرتا تھا۔''

حضرت علامہ نے یہ فرمایا تو ہم سب کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

چندے سکوت رہا۔ پھر ارشاد ہوا ''چودھری صاحب! کیا مضمون صاف ہو گیا۔''

چودھری صاحب نے کہا ''ان شاء اللہ کل تک صاف ہو جائے گا۔ پھر آپ ملاحظہ فرما لیجیے گا، آپ کی طبیعت ذرا اور اچھی ہو جائے تو ہم سب مل کر یہ بھی طے کر لیں گے نشست کب ہونی چاہیے۔''

حضرت علامہ نے کہا 'بہتر'۔ پھر ذرا دم لے کر فرمایا ''میرے مضمون سے بہت سی باتیں صاف ہو جائیں گی۔ علما حضرات کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ اپنی انگریز دشمنی میں کانگریس کا ساتھ دے رہے اور غیر اسلامی تصورات قبول کر رہے ہیں۔ کسی وقت انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے پر سرسیّد کی بڑی سختی سے تنقید کی تھی۔ یہ تنقید خلوص پر مبنی تھی اور اس میں ایک عنصر اقت کا بھی موجود تھا۔ لیکن کانگریسی خیال علما ہندوؤں کا ساتھ دے کر اس سے بڑی غلطی کر رہے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اگر قوم نے ان کا ساتھ دیا تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہو گا۔''[۶]

اور پھر دیر تک ان کی اس ذہنیت پر اظہار افسوس فرماتے رہے۔

حضرت علامہ پھر لیٹ گئے۔ ضعف و اضمحلال میں خاصی کمی تھی اور عوارض سے بھی کوئی خاص تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ کمر اور شانے کا درد دور ہو چکا تھا۔ وقت بہت کافی گزر گیا تھا اور یوں بھی معلوم ہوتا تھا جیسے حضرت علامہ کو نیند آ رہی ہے۔ ہم نے عرض کیا۔ ''علی بخش اور م۔ ش آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، اور رہیں گے۔ آپ آرام کیجیے، ہمیں آپ کے آرام کا خیال ہے، ہم اجازت چاہتے ہیں۔''

ہم لوگ اُٹھے تو قریشی صاحب نے کہا ''میں ان شاء اللہ صبح بہت سویرے حاضر ہو جاؤں گا۔''

حضرت علامہ نے اظہار اطمینان فرمایا۔ ارشاد ہوا ''بہت بہتر۔''

ہم بااطمینان جاوید منزل سے نکلے اور میورو ڈ[۷] پر قدم رکھا تو چودھری صاحب نے ہمیں

ان کی کیفیت مزاج کی اطلاع قرشی صاحب کو کردیتے تاکہ حسب ضرورت مناسب تدابیر کی جائیں۔ میں حضرت علامہ کے کمرے میں داخل ہوا تو قیصر صاحب[۲] اور حزب الاحناف کے ایک بزرگ[۳] جنھیں حضرت علامہ نے 'مولوی باز' کا خطاب دے رکھا تھا اور دو ایک اور علماے دین بیٹھے حضرت علامہ سے باتیں کررہے تھے۔ میں اور حکیم صاحب بھی سلام کرکے بیٹھ گئے۔ گفتگو یہی اتحادِ اُمت کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ان حضرات نے اجازت لی تو حضرات سالک ومہر آ گئے اور آتے ہی مجھ سے شکایت کرنے لگے کہ میں نے انھیں حضرت علامہ کی ناسازی طبیعت کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ میں خاموش رہا۔ حضرات سالک ومہر بیٹھ گئے۔ حضرت علامہ کا مزاج پوچھا اور پھر یہ دیکھ کر کہ انھیں کوئی تکلیف نہیں، بلکہ طبیعت ایک گونہ شگفتہ ہے ملکی سیاست پر گفتگو کرنے لگے۔ وہ شاید معلوم کرنا چاہتے تھے کہ حضرت علامہ کے خیالات میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے کچھ استفسار بھی کیے۔ مثلاً یہ کہ بحالت موجودہ سیاسی اور آئینی اعتبار سے جو مسائل درپیش ہیں مسلمانوں کے نزدیک ان کا بہترین حل کیا ہے؟ کیا ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی سیاسی مفاہمت ممکن ہے؟ حضرت علامہ نے مختصراً اپنا نقطۂ نظر سمجھایا۔ جہاں تک سیاسی اور آئینی مسائل کا تعلق ہے انھوں نے اپنی اس رائے کا مکرر اظہار کیا جو الٰہ آباد کے خطبہ صدارت میں پیش کرچکے تھے: اور وہ یہ کہ وفاق کی ابتدا برطانوی ہندوستان سے ہونی چاہیے سندھ، پنجاب اور بنگال کی اسلامی اکثریت کو آئینی طور پر تسلیم کرلیا جائے؛ طریق انتخاب جداگانہ ہو؛ شخصی قوانین برقرار رہیں، بعینہٖ اس قسم کے دوسرے تحفظات بھی۔ مثلاً لسانی، تہذیبی، البتہ جہاں تک کسی طرح کی سیاسی مفاہمت کا تعلق ہے فرمایا ''اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ مسلمانوں کا متحدہ محاذ، یعنی بحیثیت ایک قوم اپنے جداگانہ تشخص پر اصرار۔ لیگ کے علاوہ ساری جماعتیں توڑ دی جائیں۔''[۴]

سالک ومہر گئے تو کانگریسی اور یونینسٹ خیال مسلمانوں کی باتیں ہونے لگیں، پھر قادیانیوں اور دیوبند کی۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''قادیان اور دیوبند اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے[۵] اور دونوں اس تحریک کی پیداوار جسے عرف عام میں وہابیت کہا جاتا ہے۔''

اس پر کہا گیا کہ دیوبند کی سیاسی روش تو انگریز دشمنی پر مبنی ہے۔ دیوبند کی تو یہ رائے نہیں

کہ انگریزی حکومت کی اطاعت مذہباً فرض ہے، جیسا کہ قادیانی کہتے ہیں۔

فرمایا "انگریز دشمنی سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم اسلام دشمنی اختیار کرلیں۔ یہ کیا انگریز دشمنی ہے جس سے اسلام کو ضعف پہنچے۔ اربابِ دیوبند کو سمجھنا چاہیے کہ اس دشمنی میں وہ نادانستہ اس راستے پر چل رہے ہیں جو انگریزوں کا تجویز کردہ ہے۔ انگریز چاہتے ہیں مسلمان جغرافی وطنیت کا اُصول اختیار کرلیں تاکہ اسلام کی حیثیت ایک عقیدے سے زیادہ نہ رہے اور اُمت، یعنی بطور ایک سیاسی اجتماعی نظام کے اس کی وحدت ختم ہوجائے۔ یہ کیسی انگریز دشمنی ہے؟ یہ تو ان کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے۔"

اس پر عرض کیا گیا کہ اہلِ حدیث اقلیت میں ہیں اور اپنے عقاید میں بڑے متشدد، لہٰذا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ سوادِ اعظم میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کانگریس کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

حضرت علامہ نے فرمایا "یہ اَمر تو اور بھی افسوس ناک ہے۔ عقاید میں تشدد، تعصب اور تنگ نظری اگر اسلام کے لیے ہے تو بڑی مبارک بات ہے، لیکن اگر اس لیے ہے کہ اہلِ حدیث سوادِ اعظم سے کٹ جائیں اور اُمت کی وحدت درہم برہم ہوجائے تو از حد قابلِ افسوس۔"

فرمایا "یوں مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا تو اندیشہ ہے ان میں اور بھی طرح طرح کے غیر اسلامی تصورات بھی پھیلتے چلے جائیں گے۔"

ارشاد ہوا "اس سے زیادہ مہلک روش اور کیا ہوگی کہ مسلمانوں کی حیثیت ایک مذہبی برادری کی رہ جائے۔ ایسی آزادی تو غلامی سے بھی بدتر ہوگی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی تو پہلے ہی سے یہ خواہش ہے کہ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے مسلمان مذہب کو خیرباد کہہ دیں۔"

اس پر عرض کیا گیا کہ بعض علما کی طرف سے وطنیت کی تائید اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں باعث خطر ہے، لیکن اس کی وجہ کیا یہ تو نہیں کہ ان حضرات کی یہ روش انگریز دشمنی پر مبنی ہے۔ جب علی گڑھ کی تحریک اُٹھی اور مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی سرسیّد کی قیادت میں حکومت کا ساتھ دیا تو اہلِ حدیث نے سوادِ اعظم سے علیحدگی اختیار کرلی، جس کی ایک وجہ تھی سیاسی اختلاف۔ خیال یہ تھا کہ علی گڑھ کو انگریزوں کی حمایت منظور ہے۔ اس کا زور حکومت کی وفاداری پر ہے۔ لیگ کی تحریک بھی چونکہ علی گڑھ سے اُٹھی، یہ حضرات شاید اسی لیے کانگریس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

فرمایا "لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اہلِ دیوبند حقائق سے آنکھیں بند کرلیں اور محض انگریز دشمنی، یا عقاید میں تشدد کے باعث مصالح اُمت کا لحاظ رکھیں، نہ احکامِ شریعت کا۔ حالانکہ یہی حقائق ہیں جن کا فہم اور تشریح و توضیح ان کا سرمایہ افتخار ہے۔ یہ کیسی انگریز دشمنی ہے کہ ان کی مخالفت میں ہم اسلام کا پاس رکھیں، نہ مسلمانوں کے مستقبل کا بلکہ اُلٹا ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگیں۔ کیا اسی کا نام وہابیت ہے؟ مجھے نہیں معلوم تھا وہابیت یہ کچھ ہے۔"[٦]

عرض کیا گیا نہ یہ وہابیت ہے، نہ وہابیت میں ایسی کوئی بات۔ یہ جو کچھ ہے پچھلے چند سالوں میں ہماری ناکام قیادت کا، نتیجہ بلکہ سچ پوچھیے تو تحریک ترکِ موالات کے خاتمے سے جو انتشار رونما ہوا اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یوں بھی ہمارے معاشرے میں صدیوں کی فرقہ بندی نے بعض ایسے خیالات پھیلا رکھے ہیں جو مذہبی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے ہمارے اتحاد میں حائل ہیں۔

ارشاد ہوا "مثلاً؟"

"یہی عجمی تصوف اور اس کے زیر اثر وحدۃ الوجود کی وہ غلط تعبیر جس سے ایک بے روک آزادہ روی اور وسیع المشربی کو تحریک ہوتی ہے اور جس سے احکامِ شریعت کی حیثیت محض ظواہر کی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا فرد ان سے بے اعتنائی برتتا اور جماعت وحدت ادیان کے چکر میں اپنا تشخص کھو بیٹھی ہے۔ اسلام ہی میں کوئی بات رہ جاتی ہے، نہ اُمتِ اسلامیہ کے جداگانہ وجود میں۔"[٧]

ارشاد ہوا "اللہ نے توفیق دی تو میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ بے شک یہ ایک فتنۂ عظیم ہے جس کا ازالہ ضروری ہے، لیکن سوال یہ ہے ہمارے علما اور صوفیہ کو کیا ہو گیا۔"[٨]

نو بجے کے قریب پھر حاضر خدمت ہوا تو حضرت علامہ کی طبیعت بہت بہتر پائی۔ قریشی صاحب، چودھری صاحب، راجا صاحب، م۔ش اور راجا سیّد اکبر[٩] حاضر خدمت تھے۔ راجا سیّد اکبر تو صرف مزاج پرسی کے لیے آئے تھے، چند منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔ وہ گئے تو قریشی صاحب آ گئے۔ انھوں نے نبض دیکھی اور حضرت علامہ کا مزاج پوچھا تو فرمایا "بلھے شاہ کا ایک مصرع ہے:

سچ آکھاں تے بانبڑ مچ دا اے

اس پر والد ماجد نے کہا

چھوٹھ آکاں تاں کجھ بچ دا اے[١٠]

کر بیٹھ گئے۔ اور بڑی رقت آمیز آواز میں کہنے لگے:

....

.... عاشق ہمان کہ ہست[۱۴]

عجب پریشانی کا عالم تھا، بالخصوص اس لیے کہ اس اثنا میں حضرت علامہ کو دو ایک بار اختلاج کا ہلکا سا دورہ بھی ہوا اور اس لیے تشویش تھی کہ ان کے جذبات کی شدت کوئی اندیشہ ناک صورت نہ پیدا کر دے۔ لیکن قرشی صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا تو حضرت علامہ سے کہنے لگے: یہ اختلاج نہیں ہے احتباس ریح کہ وجہ سے قلب پر بوجھ پڑ رہا ہے۔ آپ نے جو دوا ابھی استعمال کی ہے اس سے طبیعت بحال ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اختلاج کی کیفیت جاتی رہی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ حضرت علامہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔

ساڑھے دس بج گئے اور اب حضرت علامہ کی طبیعت اس حد تک سنبھل گئی تھی جیسے انھیں کوئی تکلیف ہی نہیں تھی۔ ہم نے عرض کیا کیوں نہ آپ آرام فرمائیں۔ لیکن حضرت علامہ نے چودھری صاحب کی طرف دیکھا اور فرمایا ''مضمون کیا صاف ہو گیا؟''

انھوں نے کہا جی ہاں صاف ہو گیا۔ ارشاد ہوا ''پڑھیے۔''

اس پر ہم سب نے عرض کیا وقت زیادہ ہو گیا ہے آپ آرام فرمائیں۔ ہم آپ کا بدن دابیں گے۔ قرشی صاحب آپ کی انگلیاں اور ہاتھ سہلائیں گے۔ مضمون کا کیا ہے، کل سن لیجیے گا۔ لیکن حضرت علامہ نے فرمایا اور باصرار فرمایا ''مضمون سنا جائے گا اور آج ہی سنا جائے گا، اسی وقت۔''

ارشاد ہوا ''طبیعت کا کیا ہے، آج اچھی ہے، کل خراب۔ مضمون کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے، ہندوستان میں ان کے مستقبل کا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے جلد کہ دینا چاہیے۔ میری طبیعت بفضلہ تعالیٰ اچھی ہے۔''

اب بجز اس کے کہ حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل کی جاتی کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ چودھری صاحب نے شروع میں تو کچھ تامل کیا، پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، مضمون نکالا اور سنانا شروع کر دیا۔ حضرت علامہ بغور سنتے، جابجا اصلاح فرماتے اور ہم سے کہتے سارا مضمون غور سے سنیں۔

حضرت علامہ نے مضمون پسند فرمایا۔ چودھری صاحب نے ان کے جملہ ارشادات کی ترجمانی نہایت خوبی سے کر دی تھی، البتہ کہیں کہیں اُسلوب بیان میں اصلاح ہوئی۔ الفاظ اور

جملوں میں بھی ردو بدل کیا گیا۔ ہم مطمئن تھے کہ ایک بہت بڑا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوگیا۔ حضرت علامہ کا ذہن بھی آسودہ تھا۔ فرمایا "وہ نیازی صاحب والا جملہ بھی شامل ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔"

جملہ یہ تھا:

"افرنجیت نے اب قومیت کی آڑ لی ہے۔"[۱۴]

بارہ بج چکے تھے علی بخش حضرت علامہ کے ارشاد پر چائے لے آیا۔ چائے پی گئی، مضمون کے بارے میں کچھ اور باتیں ہوئیں تو سوال پیدا ہوا کہ مخالفین پر اس کا اثر کیا ہوگا۔ مولانا اس کے جواب میں اب کیا فرمائیں گے؟ بایں ہمہ ہماری کوشش یہ تھی کہ گفتگو طول نہ کھینچے، حضرت علامہ آرام فرمائیں اور سو جائیں۔ لیکن حضرت علامہ کا ذہن ابھی تک اس مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا کہ کانگریس نے جو بساط سیاست بچھائی ہے اس پر آزادی وطن، متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاست و معاش اور تہذیب و ترقی کے نام پر کیسے کیسے مہرے پھیلا رکھے ہیں؟ ہندو کیا کھیل کھیل رہے ہیں؟ سکھوں کے عزائم کیا ہیں؟ مسلمان کیا کر رہے ہیں؟ شیعہ، سنی، حنفی اور وہابی کی بحث کس طرح سیاست میں دخل انداز ہو رہی ہے یا داخل کی جا رہی ہے؟

ارشاد ہوا "دیوبند تو دیوبند تھا، کانگریس نے اب قادیان کو بھی ہوا دینا شروع کر دی ہے"

گویا سلسلۂ سخن اب پھر جاری تھا اور ہماری کوشش یہ کہ گفتگو کوئی سنجیدہ شکل اختیار نہ کرے تا کہ حضرت علامہ کی شگفتگی مزاج قائم رہے۔ لہٰذا چودھری صاحب جب بھی موقع پاتے قادیانی سیاست پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے۔ حضرت علامہ کی طبیعت پر بھی بیان کے ردو کد سے جو بار پڑا تھا دور ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب کہنے لگے: "مزے کی بات تو یہ ہے کہ اہلِ قادیان اگرچہ عقیدۃً ہمیں کافر سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود اتحاد کے بھی خواہش مند ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہندو بہرحال ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں۔"[۱۵]

حضرت علامہ نے فرمایا "یہ خوب منطق ہے۔ اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں، نہ ایک ہو سکتے ہیں، البتہ ایک ہیں اور ہو سکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں۔"

ارشاد ہوا "دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیں، البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے رہیں۔ یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے!"

اس پر ہم سب کو ہنسی آ گئی۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''بمقابلہ اس کے ہندوؤں کو لیجیے۔ سکھ اگر چہ مذہباً ہندو ہیں، یا کم از کم ہندو انھیں ایسا ہی سمجھتے ہیں اور فرض کیجیے نہیں سمجھتے جب بھی ان کا کہنا یہ ہے کہ سکھوں کو چاہیے ہندوؤں سے الگ نہ ہوں، اس لیے کہ مذہب کی بنا پر سیاسی فرقہ آرائی کا کوئی جواز نہیں، سیاست کو مذہب میں شامل کرنا غلط ہے۔ بایں ہمہ انھیں اکالی پارٹی بھی بڑی عزیز ہے اور از روے آئین وہ سکھوں کے لیے جداگانہ حقوق پر بھی مصر ہیں، محض اس لیے کہ مسلمانوں کو ضعف پہنچے، وہ اکثریت کے صوبوں میں اقتدار حاصل نہ کرنے پائیں۔''

ارشاد ہوا ''یہ ایک عجیب معمہ ہے جو سیاسی اور مذہبی لحاظ سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس معمے کا کوئی حل نکلنا چاہیے۔ معمہ یہ ہے کہ مسلمان سکھوں کو کیا سمجھیں؟ وہ ہندو ہیں تو کیسے؟ نہیں ہیں تو کیوں؟ ہندو قادیانیوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں؟ وہ مسلمان ہیں تو کیسے؟ نہیں ہیں تو کیوں؟ سکھ بہر حال ہندوؤں کے ساتھ رہیں گے، قادیانی البتہ مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔''[۱۶]

ہم اس منطق کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ حضرت علامہ نے کسی قدر افسردہ خاطر ہو کر فرمایا ''افسوس ہے مسلمانوں کی اکثریت کو حنفی قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے تا کہ غیر حنفی عناصر کانگریس کی طرف جھک جائیں، حالانکہ سوال نہ شیعیت کا ہے، نہ حنفیت، نہ وہابیت کا۔ سوال فقط اسلام کا ہے۔''

پھر فرمایا ''مسلمان ایک ہیں اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔''[۱۷]

ایک بج گیا۔ حضرت علامہ نے مضمون کی تصحیح اور نظر ثانی میں بڑی دماغ سوزی فرمائی تھی، لیکن الحمدللہ یہ اندیشہ کہ ان کے قلب پر کوئی خراب اثر نہ پڑے جاتا رہا۔ قرشی صاحب مطمئن تھے اور ہمیں بھی حضرت علامہ کی شگفتگی خاطر سے بڑا اطمینان تھا۔ تھوڑی دیر اور نشست رہی۔ حضرت علامہ کو نیند آ رہی تھی۔ ہم نے عرض کیا ''آپ سو جائیں اور تسلی رکھیں۔ ہم ابھی اور بیٹھیں گے، جائیں گے نہیں۔''

حضرت علامہ نے فرمایا ''بہتر۔''

پھر جب ان کی آنکھ لگ گئی اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ آرام سے سو رہے ہیں تو کمرے سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ لیکن جانے سے پہلے قرشی صاحب نے اشارے سے علی بخش کو بلایا اور تاکید کر دی کہ وہ خود اور م۔ ش بھی حضرت علامہ کو تنہا نہ چھوڑیں، کمرے ہی میں سوئیں اور ہر طرح سے ان کا خیال رکھیں۔

تعلیمات کی لحاظ سے بھی اس کے مسلمان ارکان کی رجعت پسندی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کانگریس البتہ اس پارٹی سے مطمئن تھی اس لیے کہ اس کی تنظیم غیر مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ یوں بھی اس کے ہندو اور سکھ ارکان تو بہر حال ہندوستانی قومیت سے رشتہ قائم رکھتے۔ رہے اس کے مسلمان ارکان سو انھیں یہ کہنے کی جرأت ہی نہیں تھی کہ پنجاب کی حکومت اسلامی اکثریت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ لہٰذا پنجاب کے مسلمان سیاسی اعتبار سے ہمیشہ دبے رہے اور یہی فی الحقیقت کانگریس کا مقصد بھی تھا۔ پھر اسے فریب نفس کہیے، یا عام مسلمانوں کی تسلی خاطر کے لیے ایک حیلہ کہ انھوں نے صوبائی اور ملکی معاملات میں تفریق کرتے ہوئے یہ عجیب وغریب روش اختیار کی کہ صوبے کے معاملات میں تو وہ ہندوؤں اور سکھوں کا ساتھ دیں گے، ملکی معاملات میں لیگ کا حالانکہ ہندو اور سکھ کسی معاملے میں ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ ایک اور ضرب تھی جو انھوں نے اسلامیان پنجاب کے اتحاد پر لگائی۔ ان کی اپنی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ کسی مسئلے، مثلاً شہید گنج ہی کے معاملے میں وہ حکومت پر زور ڈال سکے، نہ سکھوں پر۔ اگر یہ پارٹی نہ ہوتی تو بہت ممکن ہے پنجاب تقسیم نہ ہوتا، یا اگر ہوتا بھی تو اس کی تقسیم مسلمانوں کے حق میں ہوتی۔

۵- احادیث اور روایات پر غیر معمولی زور: دیکھیے استدراک۔

۶- یہ محض اتفاق ہے کہ لیگ جس متحدہ محاذ کی خواہاں تھی اس کے مخالفین کو وہابی یا اہلِ حدیث کہا جاتا، ورنہ سوال اہلِ حدیث کا تھا، نہ وہابیت کا۔ لیکن اختلاف اور انتشار کے اس تکلیف دہ زمانے میں جب مسلمان الگ الگ حلقوں میں بکھر گئے تھے بعض الفاظ نے اصطلاحات کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کا اطلاق صرف خاص خاص افراد یا حلقوں پر ہوتا۔ وہابیت یا دیوبند کا کانگریس کے طرف دار علما اور ان کے عقیدت مندوں پر۔ مولانا حسین احمد کانگریس کے حامی تھے۔ مولوی ثناء اللہ مرحوم مدیر اہلِ حدیث امرتسر بھی ملکی مطلع کے زیر عنوان جب سیاست حاضرہ پر تبصرہ فرماتے تو اس سے بھی کانگریس کی حمایت کا پہلو نکلتا۔ مولانا داود غزنوی کا شمار بھی زعمائے کانگریس میں ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اہلِ حدیث ہی کا رکن رکین تصور کیا جاتا تھا۔ انھیں بھی جماعت اہلِ حدیث کی تائید حاصل تھی۔ لہٰذا عام خیال یہ تھا کہ اہلِ حدیث، یا عرف عام میں 'وہابی' لیگ کے خلاف ہیں۔
دیکھیے استدراک یہاں حاشیے میں ان گوناگوں محرکات کا تجزیہ ممکن نہیں جو اس وقت کی پر اضطراب فضا میں پیدا ہو رہے تھے۔

۷- اور جس کے پیشِ نظر اسلامی ہند کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ایک عنصر تھا جو اُمت کے سیاسی اتحاد و استحکام میں حائل رہا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی عناصر تھے، مثلاً بادشاہت اور نسلی تعصبات۔ جن سے اسلام اور مسلمان دونوں کو بے حد ضعف پہنچا۔

حواشی

۱- قرشی صاحب کے کارکن، مطب میں۔

۲- ملک لال دین قیصر، لاہور کے بڑے سرگرم اور پرانے خلافتی کارکن، ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوگیا۔

۳- حزب الاحناف مولوی محمد دین مرحوم نے قائم کیا تھا اور وہی اس کے معتمد بھی تھے۔ بڑے متشدد حنفی اور بڑے سرگرم اور مخلص کارکن تھے۔ سفید (چٹا) دروازہ مسجد وزیر خان میں ان کی دکان کلاہ فروشی کو شاید اب بھی فروغ ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں پارچہ فروشی بھی کرتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی مخالفت میں ۲۶-۱۹۲۵ء میں قائم ہوا اور مولانا دیدار علی مرحوم، خطیب مسجد وزیر خان اس کے صدر قرار پائے۔ مولانا مرحوم بھی اپنے عقاید میں بڑے متشدد تھے یہ زمانہ چونکہ سلطان ابن سعود کی زبردست مخالفت اور موافقت کا تھا اس لیے لاہور میں تکفیر کا اچھا خاصا اکھاڑا قائم ہوگیا تھا۔ احناف کے نزدیک ہر وہابی کافر تھا۔ مولانا دیدار علی مرحوم بہت بڑے مکفر تھے۔ ان کی تکفیر سے شاید ہی کوئی شخص بچا ہو۔ اقبال کافر، ظفر علی کافر، کچلو کافر جس پر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا

کچلو مری مسجد میں جو آ جائے تو کافر

اور پھر جب مولانا ظفر علی بھی کافر ٹھہرائے گئے تو وہ کہاں چوکنے والے تھے۔ انھیں غصہ آ گیا اور حسبِ معمول فرمایا:

ں کے آم کی چوسی ہوئی گٹھلی کا ہے صوف یا کہ ہے قبلۂ دیدار علی کی داڑھی

۴- ظاہر ہے اس آخری رائے سے حضرات سالک و مہر کو اتفاق نہیں تھا۔ انقلاب کی روش تو یہ تھی کہ مسلمانان پنجاب کو یونینسٹ پارٹی کا ساتھ دینا چاہیے، حالانکہ یونینسٹ سیاسیات پنجاب کے ہندو مسلمان اور سکھ زمینداروں کی ایک چال تھی تاکہ ان کی زمینداریاں محفوظ رہیں۔ پھر جہاں اس پارٹی کے ہندو اور سکھ ارکان نے کانگریس کی مخالفت کے باوجود ہمیشہ ہندوؤں کا ساتھ دیا، بالخصوص ۱۹۴۶ء میں، یعنی تقسیم ملک کے موقع پر وہاں مسلمان یونینسٹوں نے زمیندار اور غیر زمیندار کی تفریق سے اتحاد اُمت میں رخنہ ڈالا اور یوں اسلامیان پنجاب میں اختلاف و انتشار کو ہوا دی۔ پھر اگرچہ کہنے کو اس جماعت میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، لیکن وہ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے دبے ہوئے تھے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ انھوں نے یونینسٹ مسلمانوں کی مدد سے مسلمانوں میں اختلاف پھیلایا اور انھیں متحد نہ ہونے دیا۔ چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں خوب خوب کامیاب ہوئے اور قوم کے یہ نام نہاد بہی خواہ ہمیشہ ان کا آلہ کار بنے رہے۔ اُصولاً اس پارٹی کی اساس پنجابیت پر تھی۔ حالانکہ یہ وطنی قومیت کے اعتبار سے تو جیسا بھی محدود اور انتشار انگیز تصور تھا اسلامی

۸- حضرت علامہ کو علما و صوفیہ کے زوال علم کا بڑا افسوس تھا۔

۹- اس زمانے میں وکیل گوجر خاں اب لاہور میں مقیم ہیں۔

۱۰- سچ کہہ دیا تو آگ بھڑک اُٹھے گی، جھوٹ کہا تو شاید بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

۱۱- چو رفت خویش بر بستم ازیں خاک ہمہ گفتند با من آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

۱۲- یہ رند اور ملا کی چشمک ہمیں فارسی شاعری سے ورثے میں ملی۔ رند کی آزادہ روی اگرچہ بظاہر حدود شریعت سے تجاوز کر جاتی ہے، لیکن اس کا مشرب وسیع اور مسلک صلح کا ہے۔ وہ حقیقت کا جویا اور انسانیت کا پرستار ہے۔ اس کی نظر انسان کے باطن اور اندرون ضمیر پر ہے، ملا کی ظواہر پر۔ اس کے پاس قشر ہی قشر ہے، مغز نہیں ہے۔ یہ صوفیانہ یعنی تصوف کے 'عجمی' نشوونما کا خاص مضمون ہے جس میں حقیقت کا ایک شمہ تو موجود ہے لیکن جس سے صوفیانہ ذہن نے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ بہرحال یہاں کہنے کی بات یہ تھی کہ غیر منقسم ہندوستان میں جب مسلمانوں کا دور ''وفاداری'' ختم ہوا اور آزادی کی تحریکوں کا دور دورہ شروع ہوا تو ان مصطلحات میں نئے معنی پیدا ہوگئے۔ مولانا ابوالکلام ''علمائے دین'' کی عام بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے ''الہلال'' میں جب کبھی قلم اُٹھاتے تو بافسوس فرماتے:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

یوں زاہد اور رند اور ملا نے تصوف کی حدود سے نکل کر سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ پھر جب ہندی اسلامی سیاست نے کانگریس کے زیر اثر وطنی قومیت کا ساتھ دیا اور علمائے دین کی انگریز دشمنی نے کانگریس کی حمایت میں زبان کھولی اور نہیں سمجھے کہ آزادی ہند کا مسئلہ فی الحقیقت ہے کیا، یا یہ کہ اس جدوجہد میں از روئے اسلام ان کا موقف کیا ہونا چاہیے، جس کی وجہ تھی بطور ایک نظام اجتماع اُمت کے مصالح سے ان کی بے خبری، تو رند اور ملا کی اصطلاحوں میں نئے معنی پیدا ہوگئے۔ رند اسلام کا رازدار ٹھہرا، ملا اس سے بے خبر۔

۱۳- شعر کیا ہے؟ راقم الحروف بھول گیا۔

۱۴- ہر اعتبار سے، بالخصوص ان معنوں میں کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔

۱۵- یہ اس زمانے میں قادیان کی عام منطق تھی۔

۱۶- یہ اس وقت ہندو سیاست کا عام انداز تھا۔

۱۷- اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔

❁┈┈❁┈┈❁

تعلیمات کی لحاظ سے بھی اس کے مسلمان ارکان کی رجعت پسندی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کانگریس البتہ اس پارٹی سے مطمئن تھی اس لیے کہ اس کی تنظیم غیر مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ یوں بھی اس کے ہندو اور سکھ ارکان تو بہر حال ہندوستانی قومیت سے رشتہ قائم رکھتے۔ رہے اس کے مسلمان ارکان سو انھیں یہ کہنے کی جرأت ہی نہیں تھی کہ پنجاب کی حکومت اسلامی اکثریت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ لہٰذا پنجاب کے مسلمان سیاسی اعتبار سے ہمیشہ دبے رہے اور یہی فی الحقیقت کانگریس کا مقصد بھی تھا۔ پھر اسے فریب نفس کہیے، یا عام مسلمانوں کی تسلی خاطر کے لیے ایک حیلہ کہ انھوں نے صوبائی اور ملکی معاملات میں تفریق کرتے ہوئے یہ عجیب وغریب روش اختیار کی کہ صوبے کے معاملات میں تو وہ ہندوؤں اور سکھوں کا ساتھ دیں گے، ملکی معاملات میں لیگ کا حالانکہ ہندو اور سکھ کسی معاملے میں ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ ایک اور ضرب تھی جو انھوں نے اسلامیان پنجاب کے اتحاد پر لگائی۔ ان کی اپنی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ کسی مسلے، مثلاً شہید گنج ہی کے معاملے میں وہ حکومت پر زور ڈال سکے، نہ سکھوں پر۔ اگر یہ پارٹی نہ ہوتی تو بہت ممکن ہے پنجاب تقسیم نہ ہوتا، یا اگر ہوتا بھی تو اس کی تقسیم مسلمانوں کے حق میں ہوتی۔

۵- احادیث اور روایات پر غیر معمولی زور: دیکھیے استدراک۔

۶- یہ محض اتفاق ہے کہ لیگ جس متحدہ محاذ کی خواہاں تھی اس کے مخالفین کو وہابی یا اہلِ حدیث کہا جاتا، ورنہ [illegible] اہلِ حدیث کا تھا، نہ وہابیت کا۔ لیکن اختلاف اور انتشار کے اس تکلیف دہ زمانے میں جب [illegible]ن الگ الگ حلقوں میں بکھر گئے تھے بعض الفاظ نے اصطلاحات کی شکل اختیار کر لی تھی اور ان کا اطلاق صرف خاص خاص افراد یا حلقوں پر ہوتا۔ وہابیت یا دیوبند کا کانگریس کے طرف دار علما اور ان کے عقیدت مندوں پر۔ مولانا حسین احمد کانگریس کے حامی تھے۔ مولوی ثناء اللہ مرحوم مدیر اہل حدیث امرتسر بھی ملکی مطلع کے زیر عنوان جب سیاست حاضرہ پر تبصرہ فرماتے تو اس سے بھی کانگریس کی حمایت کا پہلو نکلتا۔ مولانا داود غزنوی کا شمار بھی زعمائے کانگریس میں ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اہلِ حدیث ہی کا رکن رکین تصور کیا جاتا تھا۔ انھیں بھی جماعت اہلِ حدیث کی تائید حاصل تھی۔ لہٰذا عام خیال یہ تھا کہ اہلِ حدیث، یا عرف عام میں 'وہابی' لیگ کے خلاف ہیں۔
دیکھیے استدراک یہاں حاشیے میں ان گوناگوں محرکات کا تجزیہ ممکن نہیں جو اس وقت کی پر اضطراب فضا میں پیدا ہو رہے تھے۔

۷- اور جس کے پیشِ نظر اسلامی ہند کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ایک عنصر تھا جو اُمت کے سیاسی اتحاد و استحکام میں حائل رہا۔ علاوہ اس کے اور بھی کئی عناصر تھے، مثلاً بادشاہت اور نسلی تعصبات۔ جن سے اسلام اور مسلمان دونوں کو بے حد ضعف پہنچا۔

ارشاد ہوا ''یہی کہ طبیعت کا وہی حال ہے جو آپ دیکھ گئے تھے۔ مجھے اطمینان ہے۔''

شام سے پہلے پھر قریشی صاحب سے ملا، گھر پہنچا اور جاوید منزل کا راستہ لیا۔ اس سے پہلے بھی قریشی صاحب سے مل چکا تھا۔ وہ خود بھی سہ پہر میں کسی وقت حضرت علامہ کو دیکھ آئے تھے اور خوش تھے کہ ان کی طبیعت بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ کہنے لگے ''خطرے کا امکان نسبتاً کم ہو گیا ہے۔''

جاوید منزل پہنچا تو م۔ش اور علی بخش نے بھی بڑا اطمینان ظاہر کیا۔ معلوم ہوا حضرت علامہ بڑے آسودہ خاطر ہیں۔ جس کسی نے مزاج پوچھا، فرمایا: ''الحمدللہ اچھا ہوں۔'' دن میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں ابھی صحن ہی میں تھا کہ قریشی صاحب اور چودھری صاحب بھی تشریف لے آئے۔ راجا صاحب کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ تھوڑی دیر میں خواجہ عبدالرحیم بھی آ گئے اور ہم سب ایک ساتھ حضرت علامہ کی خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ حضرت علامہ نے حسبِ معمول فرمایا ''آیئے۔''

ہم سب مزاج پرسی کے بعد قریب ہو کر بیٹھ گئے تو قریشی صاحب نے حضرت علامہ کی نبض دیکھی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ حضرت علامہ خواجہ صاحب سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا ''کہیے خواجہ صاحب کیا حال ہے؟ آپ کہاں تھے؟ کچھ سرکار دولت مدار اور اس کے ہوا خواہوں کی بات کیجیے۔''

خواجہ صاحب مسکرائے اور اپنی غیر حاضری کی معذرت کرنے لگے۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''اس وقت جو حالات ہیں ان میں مسلمانوں کا گزر ایک بڑے نازک مرحلے سے ہو رہا ہے۔ وہ متحد نہ ہوئے اور نہیں سمجھے کہ اسلام ان سے کس قسم کے عمل کا طلب ہے تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

ارشاد ہوا ''نئی تعلیم آئی اور الحاد اور دہریت ساتھ لائی۔ مدرسے اور خانقاہیں کب سے ویران پڑی ہیں۔ دیو بند کی دینی عصبیت سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ دیو بند کو کیا ہوا؟''

پھر چودھری صاحب سے دریافت فرمایا ''چودھری صاحب! مضمون کیا صاف ہو گیا؟''

چودھری صاحب نے کہا ''ان شاء اللہ کل تک صاف ہو جائے گا۔''

علی بخش کھانا لے آیا۔ حضرت علامہ نے کھانا کھایا اور پھر ذرا سی دیر کے بعد قریشی صاحب کے زیرِ ہدایت کوئی دوا کھائی، حقے کے کش لیے، تکیوں سے ٹیک لگائی تا کہ آرام فرمائیں۔ راجا صاحب اور خواجہ صاحب سے کبھی کبھی کوئی بات کر لیتے، لیکن ہماری کوشش یہی

تھی کہ حضرت علامہ زیادہ گفتگو نہ کریں۔

نو بج گئے۔ خواجہ صاحب اور راجا صاحب نے اجازت لی۔ م۔ش بھی کسی کام کے خیال سے دوسرے کمرے میں چلے گئے، مگر پھر جلدی واپس آ گئے۔ اب صرف چودھری صاحب، قرشی صاحب اور راقم الحروف حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے یا علی بخش اور رحما کہ ان کا بدن داب رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا حضرت علامہ کو لیٹے لیٹے نیند آ گئی ہے۔ ہم لوگ مطمئن تھے اور آہستہ آہستہ آپس مین باتیں کر رہے تھے کہ حضرت علامہ نے ایک آدھ بار اختلاج کی شکایت کی، مگر ایسی خفیف کہ عرق گل گاؤ زبان کے استعمال سے فوراً جاتی رہی۔ حضرت علامہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی طبیعت بڑی شگفتہ تھی، چنانچہ ایک بار جب انھوں نے علی بخش اور چودھری صاحب کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا ''علی بخش کو چودھری صاحب سے وہی نسبت ہے جو سوہنی کو مہینوال سے۔''

علی بخش کھلکھلا کر ہنس پڑا، مگر پھر یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ کروٹ بدلنا چاہتے ہیں، آگے بڑھا۔ حضرت علامہ نے کروٹ لی اور علی بخش تکیوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے ان کی کمر دابنے لگا۔ قرشی صاحب کہنے لگے ''کہیے چودھری صاحب! آپ کی اس نسبت کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' م۔ش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ چودھری صاحب کو بھی ہنسی آ رہی تھی۔ حضرت علامہ بھی خوش تھے۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے ان کی آنکھ لگ گئی ہے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے کہ حضرت علامہ جو فی الواقع سو گئے تھے، دس پندرہ منٹ کے بعد جاگ اُٹھے، کروٹ بدلی اور حقے کا کش لگا کر مجھ سے فرمایا کہ تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ بیان کروں۔ میں پہلے تو کچھ خاموش رہا، پھر کچھ ازرہ امتثال اَمر اور کچھ اس خیال سے کہ حضرت علامہ کا دل بہلا رہے تاریخ اسلام کا کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کرتا رہا۔ حضرت علامہ واقعات کو سنتے اور محظوظ ہوتے۔ ایک مرتبہ دفعتاً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا ''اسپین کو اسلامی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن اسپین کی تاریخ ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے۔''

پھر کچھ رُک گئے اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہنے لگے ''اسپین کیا، مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں۔ یہ شعر و شاعری کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں! کاش میں نے شاعری نہ کی ہوتی۔''

قرشی صاحب نے کہا ''لیکن آپ نے تو شاعری کے پردے میں وہ سارا کام کر ڈالا جو

فلسفیوں ارمؤرخوں، علما اور فقہا کے کرنے کا تھا۔ آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ آپ نے شاعری نہ کی ہوتی۔ ہمیں تو اس شاعری پر ناز ہے، حتیٰ کہ وہ جو کہا گیا ہے:

مانہ بودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

غالب نے دراصل آپ ہی کے لیے کہا تھا۔ اس سے کیسے انکار ہوسکتا ہے؟ آپ کو تو غالب کی طرح یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں:

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست''

حضرت علامہ نے قدرے تبسم فرمایا، مگر کہا کچھ نہیں۔ میں چودھری صاحب اور قرشی صاحب کے اشارے سے پھر واقعات بیان کرنے لگا، زیادہ تر اندلس اور تاریخ اندلس ہی کے بارے میں۔ قرشی صاحب اور چودھری صاحب بھی کسی نہ کسی بات کا اضافہ کردیتے تاکہ واقعات کی دل چسپی قائم رہے۔ یوں دس پندرہ منٹ گزرے تو ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہ پر غنودگی طاری ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔ چودھری صاحب اور قرشی صاحب بھی خاموش تھے۔ زیادہ ہوگیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ چپ چاپ خواب گاہ سے باہر نکل آئیں تاکہ حضرت علامہ کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ حضرت علامہ دفعتاً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور جیسے ہم سے خطاب مقصود ہو اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہ شدت تأثر سے اور بھی گلوگیر ہو رہی تھی بڑے دردناک انداز میں ارشاد فرمایا:

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب
بر دل آمد و این آفت از مینا گزشت

اور دوسرا مصرع پڑھتے پڑھتے اتنا روئے کہ ہم پریشان ہوگئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ کبھی سو جاتے، کبھی کوئی بات کرتے، کبھی مسلمانوں کی حالت پر اشک باری فرماتے۔ م- ش کہنے لگے ''رات کو جب کبھی آنکھ کھلتی ہے تو اکثر کہتے ہیں: افسوس ہے، بڑا افسوس، مولانا حسین احمد نے یہ کیسے کہہ دیا قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔''

ہم خاموش تھے اور پریشان بھی۔ حضرت علامہ پھر لیٹ گئے۔ علی بخش اور رحمان کا بدن

دابنے لگے، م۔ ش شانے اور کمر۔ قریشی صاحب بھی جیسا کہ ان کا معمول تھا حضرت علامہ کے ہاتھ سہلاتے رہے۔ وہ کرسی کو آگے بڑھائے حضرت علامہ کے پلنگ سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی انگلیاں حضرت علامہ کی نبض پر تھیں اور وہ گویا اشارتاً ہم سے کہہ رہے تھے کہ اطمینان رکھیں، حضرت علامہ کو نیند آرہی ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ تھوڑی دیر کے لیے سو بھی گئے۔ مگر پھر جلد ہی اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے ''علی بخش چائے کا اہتمام کرو۔ یہ لوگ کب سے بیٹھے ہیں۔''

ان کی طبیعت اب پھر مائل بہ گفتگو تھی۔ زیادہ تر لیگ کے استحکام، مسلمانوں کے اتحاد اور یونینسٹ پارٹی کا ذکر رہا۔ چودھری صاحب یونینسٹ ارکان کی غلامانہ ذہنیت، ان کی بے حسی اور بے غیرتی کا کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کرتے۔ حضرت علامہ ان واقعات کو سنتے تو افسوس فرماتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ''ان لوگوں کے طور طریق پر قاآنی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

....

.... کو خرمی کنند''[1]

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است
جبیں خود منہ جز بردر او
سریں را ہم بہ پیشش دہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالان گر او

حواشی

١- شاید یہی خیال تھا جس کے زیر اثر ارمغان حجاز کی یہ رباعی موزوں ہوئی:

صاحب البتہ نہیں آئے تھے اور یہ اُمر ایک گونہ باعث تعجب تھا۔ حضرت علامہ نے بھی دو ایک بار دریافت فرمایا ''راجا صاحب کہاں ہیں؟''

عرض کیا گیا، آتے ہی ہوں گے۔

حضرت علامہ نے کھانا کھایا تو علی بخش نے چائے کا اہتمام کیا۔ لیکن علی بخش بہت تھک گیا ہے۔ گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ بار بار حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری، چائے اور حقے کا اہتمام، حضرت علامہ کے ساتھ مسلسل بے خوابی، یہ سب کام ہیں جو علی بخش کو کرنا پڑتے ہیں۔ مگر آفرین ہے علی بخش کو کہ حضرت علامہ کی محبت میں اسے اپنی تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ دیوان علی کے آنے سے البتہ اسے خاصا اطمینان ہوگیا ہے۔ حضرت علامہ کا اصرار تھا کہ رحما کے علاوہ ایک اور آدمی کا انتظام کرلینا چاہیے تاکہ ملازمین باری باری سے آرام کرسکیں۔ دیوان علی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پنجابی کے صوفی شعرا کا بہت سا کلام اسے حفظ ہے۔ آواز بھی غنیمت ہے۔ اس سے اکثر بلھے شاہ کی کافیاں، سی حرفی ہدایت اللہ، یوسف زلیخا اور بعض دوسرے شاعروں کا کلام سنا جاتا ہے۔

دیر تک نشست رہی اور حضرت علامہ کی شگفتگی خاطر کے لیے ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح حضرت علامہ کا دل بہلا رہے۔ حضرت علامہ کبھی کبھی سو بھی جاتے، کبھی مسلمانوں کی گذشتہ اور آیندہ سیاست کے پیشِ نظر مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے سوال پتے۔ کیا لیگ کو کچھ سرمایہ مل سکتا ہے؟ کیا مسلمان کوئی عملی اقدام کریں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر معلوم نہیں کس طرح غالب کا ذکر آ گیا۔ شاید چودھری صاحب نے اربابِ اقتدار پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کا کوئی شعر پڑھا تھا کہ قرشی صاحب نے کہا ''غالب خوب شاعر تھا۔''

حضرت علامہ نے فرمایا ''غالب واقعی بہت بڑا شاعر تھا لیکن محض پنشن میں اضافے کے خیال سے سرکار انگلشیہ کی مدح میں قصائد لکھنا بڑے افسوس کی بات ہے[۵]۔ غالب کی اس روش سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔''

پھر فرمایا ''غالب کا کلام دراصل فارسی ہی میں ہے۔ غالب کا فارسی کلام پڑھیے اور ضرور پڑھیے۔ غالب کا فارسی کلام بڑی چیز ہے۔''

پھر ارشاد ہوا ''غلامی بہت بڑی لعنت ہے۔ غلامی زبان سے وہ کچھ بھی کہلوا دیتی ہے جو انسان نہیں کہنا چاہتا، دانستہ اور نادانستہ بھی۔''

حضرت علامہ کو شاید افسوس تھا کہ خود ان کی زبان سے بھی تو ایسے اشعار نکل چکے ہیں جن میں سرکار انگلشیہ کی مدح سرائی کی گئی ہے[۶] یہ مجبوری تھی یا معذوری، جو کچھ بھی تھا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ حضرت علامہ شاید اسی خیال سے خاموش ہو گئے۔

ہم بھی خاموش تھے۔

حواشی

۱- یہ حضرات کارپرداز ہی تو تھے۔

۲- حضرت علامہ کے علاج کے بارے میں۔

۳- خان بہادر ملک زمان مہدی مرحوم بڑے دردمند اور مخلص انسان تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ وطن ان کا بھرت تھا، مضافات شاہ آباد ضلع کرنال میں۔ ملازمت کا سلسلہ ڈپٹی کمشنری پر ختم ہوا۔ چند دن مالیر کوٹلہ میں بھی رہے۔ پھر حضرت علامہ کے ایما سے لیگ میں شریک ہو گئے اور پنجاب مسلم لیگ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ملک برکت علی مرحوم اور خان غلام رسول خان مرحوم کے ساتھ انھوں نے یونینسٹ پارٹی کی شدید مخالفت کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ کا نام زندہ رکھا۔ پنجاب میں لیگ کے اس دور کی تاریخ بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ حضرت علامہ کے وجود سے اسے جس طرح تقویت پہنچی وہ ایک الگ مبحث ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

۴- یہ سب حضرت علامہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اجلاس لاہور میں نہ ہو سکا۔

۵- مثلاً ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ان کا قصیدہ:

خود روزگار ہا نتواند شمار یافت

یہ "نتواند شمار یافت" کے الفاظ کس قدر تکلیف دہ ہیں۔ معاذ اللہ!

بایں ہمہ حضرت علامہ غالب کی عظمت کے قائل تھے۔ انھوں نے غالب کی شخصیت کو غالب کی شاعری سے کبھی جدا نہیں کیا۔ گویا وہ جب اسے بہت بڑا شاعر کہتے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوتا کہ وہ بہت بڑا انسان بھی تھا۔

۶- ۱۸-۱۹۱۷ میں:

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند

اور میاں امیر الدین[۳] آئے ہیں۔''

حضرت علامہ نے فرمایا ''بہت خوب۔''[۴]

پھر فرمایا، ''انھیں اندر لے آؤ۔''

علی بخش نے دو کرسیاں اور ڈال دیں۔ میں اور راجا صاحب ذرا ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت علامہ نے نواب صاحب اور میاں صاحب کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کے سلام کا جواب دے کر نواب صاحب کی غیرت ملی پر انھیں مبارک باد دی۔

ارشاد ہوا ''خدا کرے سب رئیسوں کا دل آپ کا سا ہو جائے۔''

نواب صاحب از راہ انکسار مسکرائے، پھر لیگ کے اجتماع لاہور اور اس کی صدارت[۵] کی باتیں کرنے لگے۔

حضرت علامہ نے فرمایا ''اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ اسمبلی میں بھی لیگ پارٹی قائم ہو جائے۔''

پھر ملک برکت علی کے مسودۂ قانون[۶] کی تعریف کی۔ فرمایا ''اس بات کو اُٹھارہ انیس برس ہو گئے۔ میاں فضل حسین مرحوم نے سکھوں کی درخواست کے بغیر خود ہی گوردوارہ بل پیش کر [illegible] تھا[۷] اس بل نے سکھوں کو متحد کر دیا اور وہ ایک جداگانہ قوم بن گئے، حالانکہ اس سے پہ[illegible]ں کے گوردواروں پر مہنتوں کا قبضہ تھا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر اوقاف کا معاملہ جوں کا توں پڑا رہا۔''[۸]

فرمایا ''میاں صاحب سے بارہا درخواستیں اور التجائیں کی گئیں کہ خدا را گوردوارہ بل پیش نہ کیجیے، مگر انھوں نے مسلمانوں کے انتشار کو سکھوں کے اتحاد پر ترجیح دی۔''[۹]

میں نے اور راجا صاحب نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ خیال تھا کہ ممکن ہے نواب صاحب کو تخلیے کی ضرورت ہو اور وہ حضرت علامہ سے کوئی راز کی بات کہنا چاہتے ہوں، چنانچہ ہم نے اجازت لی۔

شام کو جاوید منزل پہنچا تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا راجا صاحب تو ابھی گئے ہیں، چودھری صاحب اور قرشی صاحب البتہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ میں نے خواب گاہ میں داخل ہو کر سلام عرض کیا تو یہ دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی کہ حضرت علامہ کچھ بے چ[illegible]م۔ ش اور علی بخش ہی نہیں، قرشی صاحب بھی ان کا بدن داب رہے ہیں حضرت

علامہ بار بار کروٹ بدلتے۔ کچھ ضیق کی تکلیف تھی، کچھ درد کی۔ اس حالت میں بار بار ''یا اللہ'' کہتے۔ ایک مرتبہ بڑی دل سوزی کے لہجے میں فرمایا ''مجھے صحت ہو جائے تو جہاد بالسیف کروں۔''

قریشی صاحب نے کہا ''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے مگر آپ کو جہاد بالسیف کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ جہاد بالسیف سے کم تو نہیں۔ یہ تو صرف مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ہم ان کے کہنے کو مطلقاً خاطر میں نہیں لاتے۔ آپ کی بے عملی ہزار عمل سے بہتر ہے۔''

حضرت علامہ نے ''یا اللہ'' کہا اور خاموش ہو گئے۔

چند منٹ گزر گئے۔ میں بھی ان کا بدن دابنے لگا۔ حضرت علامہ نے پھر سر اُٹھایا اور کرب کی سی حالت میں کہنے لگے ''مولوی کا ذہن پچھلے سو برس سے عقیم چلا آتا ہے۔ دیوبند ہی کو دیکھیے۔ دیوبند بھی انگریزی شہنشاہیت کی غیر ارادی تخلیق ہے۔''

ہمیں تعجب تھا حضرت علامہ کیا کہہ رہے ہیں؟ دیوبند کو انگریزی شہنشاہیت سے کیا نسبت؟ دیوبند سے زیادہ انگریزی تعلیم کی مخالفت کس نے کی؟ دیوبند ہمیشہ برطانوی اقتدار کا مخالف رہا، بلکہ اس کے خلاف عملاً قدم اُٹھایا۔ ہم منتظر تھے کہ حضرت علامہ اپنے ارشادات کی صراحت ح فرماتے ہیں۔ لیکن حضرت علامہ نے دم کشی کے باعث اپنا سر پھر تکیے پر ٹیک دیا، البتہ چند لحوں کے بعد قدرے سکون ہوا تو ارشاد فرمایا ''میری بات سے غلط فہمی نہ ہو۔ ملا کا ذہن فی الواقع عقیم ہے اور پچھلی ایک صدی کی تاریخ اس اَمر کی شاہد کہ ملا غور و فکر سے محروم ہے۔''

ہم نے عرض کیا ''ہمیں اسلامی ہند کے زوال علم سے انکار نہیں، لیکن دیوبند کا وجود کیا مستثنیات میں سے نہیں ہے؟ دیوبند کبھی غلامی پر راضی نہیں ہوا۔ حضرت شیخ الہند کا تعلق دیوبند سے تھا۔ مولانا حسین احمد بھی دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں انھوں نے انگریزی حکومت کے ہاتھوں کیا کچھ سختیاں برداشت نہیں کیں۔ اس وقت بھی وہ جو کچھ کر رہے ہیں انگریزوں کی مخالفت ہی میں کر رہے ہیں۔ رہے بانی دیوبند مولانا محمد قاسم، سو وہ ایک بہت بڑی اصلاحی تحریک لے کر اُٹھے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ قوم اور وطن کے بارے میں دیوبند کی طرف سے اب جن خیالات کا اظہار ہو رہا ہے مصالح اُمت کے منافی ہیں، لیکن یہ خیالات غالباً [illegible] دیوبند کے نہیں ہیں۔

حضرت علامہ سانس کی تکلیف کے باعث مسلسل گفتگو نہیں کر سکتے تھے اور ہم بھی نہیں چاہتے تھے کہ گفتگو فرمائیں، مبادا ان کی تکلیف بڑھ جائے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے رُک رُک کر فرمایا "ملا کا ذہن یوں عقیم ہے کہ صدیوں کی فرسودہ اور لاطائل بحثوں میں اُلجھ کر اس کی فکری صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اسے جن عقاید پر سختی سے اصرار ہے اسلام نے ان کا رشتہ زندگی سے کس طرح جوڑا، ان سے فی الحقیقت کیا مقصود ہے۔

حضرت علامہ یہ فرما رہے تھے اور میرا ذہن ضرب کلیم کے ان اشعار کی طرف منتقل ہو رہا تھا جن میں انھوں نے ملا و صوفی کے زوال علم و عمل پر اظہار افسوس کیا ہے۔[۱۰] چودھری صاحب اور قرشی صاحب معلوم نہیں کیا کہ رہے تھے کہ حضرت علامہ نے فرمایا "مولانا محمد قاسم[۱۱] کے نام سر سیّد کا ایک خط ہے جس میں وہ اپنے عقاید فہرست وار بیان کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ ان میں کون سی بات ہے جس کی بنا پر علمائے سہارن پور انھیں کافر ٹھہراتے ہیں۔"[۱۲]

دم کشی کی تکلیف تھی۔ ہم خاموش بیٹھے حضرت علامہ کے ارشادات سن رہے تھے۔ ان کی نقاہت اور اضمحلال کی یہ کیفیت تھی کہ بمشکل ایک جملہ ادا کرتے۔ سانس پھول رہا تھا، چہرہ زرد ہو رہا تھا، ہماری تشویش بڑھ رہی تھی کہ یوں رُک رُک کر بات کرنے میں ان کے قلب پر جو زور پڑتا ہے اس سے کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔

انھوں نے پھر فرمایا "یہاں بحث سر سیّد کے معتقدات سے نہیں۔ بحث اس اَمر سے ہے کہ اسلام اور کفر کا مابہ الامتیاز کیا ہے؟[۱۳] اسلام جو کچھ بھی ہے اپنی جگہ پر واضح ہے۔ اس میں کوئی اُلجھاؤ ہے، نہ اُلجھ پیچ کہ ہم اسلام اور کفر میں فرق نہ کر سکیں، یا اس باب میں کسی مخصوص تنظیم کا رُخ کریں۔"

فرمایا "علمائے سہارن پور نے یہ نہیں سوچا کہ سر سیّد نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، تہذیب الاخلاق نکالا، علی گڑھ کالج قائم کیا یا مسائل الٰہیات پر قلم اُٹھایا تو اس سے ان کا مدعا کیا تھا: یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو۔ وہ ایک قوم ہیں۔ لہٰذا بحیثیت ایک قوم انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کے سیاسی معاشی استیلا یا علوم و فنون میں ان کے اجتہادات اور اختراعات نے ہمارے لیے کیا مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ وہ اعتماد رکھیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کی جو رَو انگریزی تسلط کے ساتھ آ گئی ہے۔ ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ ہم اس سے

استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ اسلامی عقاید کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔"

قریشی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے، شاید اس خیال سے کہ حضرت علامہ کا ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہو جائے، وہ آرام سے لیٹے رہیں اور ہم ان کی تفریحِ طبع کے لیے کوئی مناسب موضوع چھیڑیں کہ انھوں نے فرمایا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسیّد کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے وہ تنقید سے بالاتر نہیں۔ ان میں گفتگو کی گنجایش ہے۔ لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔ سرسیّد کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا۔ یہ اقدام بہر حال ضروری تھا۔ یہی بات ہے جو ان کے نکتہ چینیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

حضرت علامہ کے اس ارشاد پر معلوم نہیں میری زبان سے کیسے نکل گیا "اور دیو بند؟"

ارشاد ہوا "دیو بند بھی نہیں سمجھا کہ سرسیّد نے ایک نیا دار العلوم قائم کیا تو کیوں؟ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ اور دیو بند میں تعاون کی کوئی صورت پیدا ہوئی، نہ مفاہمت کی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹتے گئے۔ ایک نے قدامت، دوسرے نے تجدد کا سہارا لیا۔ مگر یہ جو کچھ ہوا ٹھیک نہیں ہوا۔ اگر علی گڑھ اور دیو بند ایک دوسرے کو سمجھ لیتے تو ہمارے ذہن میں دین کا تصور اور زیادہ راسخ ہو جاتا۔ ہم اپنے مسائل کو زیادہ بہتر سمجھتے اور جیسے بھی حالات ہیں ان میں اپنا موقف زیادہ صحت اور یک جہتی سے متعین کر سکتے۔"

میں نے عرض کیا "دیو بند کی نظر بھی تعلیم اور معاشرے پر تھی؟ اس کے مقاصد بھی سیاسی تھے؟"

چودھری صاحب اور قریشی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ سلسلۂ گفتگو آگے بڑھے، لیکن مجھے مجبوراً یہ سوال کرنا پڑا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ حضرت علامہ کے ارشادات پر خاموشی مناسب نہیں۔ یہ نہ صرف سوئے ادب بلکہ بہت بڑی گستاخی ہوگی کہ حضرت علامہ گفتگو کرنا چاہیں مگر ہم سلسلۂ گفتگو کو آگے نہ بڑھنے دیں۔

ارشاد ہوا "قوموں کی زندگی تحریکوں سے ہے۔ تحریکیں ہیں تو قومیں بھی زندہ ہیں۔ وہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھتی اور ان کے پیشِ نظر مختلف سمتوں میں قدم اُٹھاتی ہیں۔ یوں ان کے مستقبل کا رُخ متعین ہو جاتا ہے۔ تحریکیں گویا وہ اقدامات ہیں جو زندگی کی پیش رَو حرکت کے

اُٹھائی تھی، نہ اجتہاد اور تفقہ کی وہ روح حرکت میں آئی جس سے ان مسائل کے حل کا کوئی راستہ نکلتا جو اس وقت عالمِ اسلام کو پیش آرہے تھے۔ برعکس اس کے نجد اور حجاز میں جس مذہبی اور سیاسی نزاع کا آغاز ہوا اس سے اقوامِ مغرب نے جیسا چاہا فائدہ اُٹھایا۔ انھوں نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف ایک کے بعد دوسری مشکل پیدا کردی۔ انگریزوں کو موقع ملا کہ عربوں کے یہاں اپنے اثر و رسوخ کے لیے ایک اور راستہ تلاش کریں۔ ظاہر ہے یہ اَمر نہ تو اتحادِ اُمت کے لیے مفید تھا، نہ عالمِ اسلام کے استحکام کے لیے۔"

حضرت علامہ ذرا سا رُک گئے۔ دم کشی کی تکلیف کم ہوئی تو فرمایا: "حالانکہ کوئی بھی معاملہ ہو، اُمورِ سیاست، یا اُصول و عقاید کی بحث، ضرورت اس اَمر کی تھی کہ عالمِ اسلام کے افتراق و انتشار کو روکا جائے۔[۲۰] مگر انتشار و افتراق ہی کا سدِ باب نہیں ہوا۔ برعکس اس کے ایک نئی فرقہ بندی ظہور میں آئی اور حاصل یہ کہ اس تحریک کے داعی پہلے سے بھی زیادہ تقلید اور قدامت پسندی کی نذر ہوگئے۔"[۲۱]

میں نے عرض کیا "کیا اس لیے کہ اس تحریک نے جس آزادیِ اجتہاد پر زور دیا تھا اس کا دائرہ بڑا محدود تھا۔ یہ احتجاج بعض سطحی باتوں سے آگے نہیں بڑھا؟"

فرمایا "اسلام ایک وحدت ہے جس میں فرد اور جماعت کو جزو و کل کا سا تعلق ہے۔ یہی [illegible]ت حیاتِ ملّی کے ایک پہلو کو دوسرے سے ہے۔"

فرمایا "اسلام کی روح اجتماعی ہے، لہٰذا عالمِ اسلام کا زوال و انحطاط رُک سکتا ہے تو کسی ایسی ہی تحریک سے جو اس پورے کل پر محیط ہو جسے ہم دینِ اسلام سے تعبیر کرتے ہیں، قطعِ نظر اس سے کہ یوں دیکھنے میں اس کی نوعیت سیاسی ہو یا اجتماعی، اخلاقی یا مذہبی یعنی کسی ایک پہلو پر مرکوز۔

ارشاد ہوا "گو بحالتِ موجودہ جو تحریک بھی اُٹھے گی اس کی نوعیت لازماً سیاسی ہوگی۔ بغیر اس کے ناممکن ہے ہماری نشاۃ الثانیہ میں کوئی معنی پیدا ہوں۔ ہم اپنا اختیار و اقتدار کھو بیٹھے ہیں۔ ہمارا شیرازۂ وحدت بکھر چکا ہے۔ ہماری کوئی سیاست نہیں۔ سیاست نام ہے اتحاد و ارتباط کا۔ سیاست عبارت ہے اختیار و اقتدار سے۔ اختیار و اقتدار ہے تو وہ زندگی بھی جس کے ہم آرزومند ہیں۔"

فرمایا سیاست کو قوم سے وہی نسبت ہے جو جسم سے جان کو۔ سیاست زندگی ہے، سیاست آزادی ہے، اقدام ہے۔ سیاست کے معنی ہیں حیاتِ ملّی کا شعور۔ سیاست سے مدعا ہے اس

فرمایا: ”لیکن اگر کسی تحریک کی نوعیت محض فقہی ہے، یا اخلاقی اور اصلاحی، یا اس کا رُخ ان معنوں میں سیاست کی طرف ہے کہ اس سے کسی خطرے کی پیش بندی مقصود ہے جو کسی پہلو سے ملت کو درپیش ہے تو اس کی ضرورت اور مصلحت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی اساس خالصاً اسلامی ہو، یعنی اس اُصول پر مبنی جو ہماری حیاتِ ملّی کا صورت گر ہے۔ بعینہٖ جیسے ایک طبیب حاذق کسی معمولی سے معمولی مرض کا علاج بھی کرتا ہے تو پورے جسم کی صحت اور حفاظت کی رعایت سے۔“

پھر فرمایا: ”لیکن یہی بات ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ ہر اصلاحی اخلاقی تحریک کسی نہ کسی فرقہ بندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عالمِ اسلام میں اکثر ایسا ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ یہ طرزِ عمل اتحادِ اُمت کے منافی ہے۔ اس سے اُمت کے احیا کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے، نہ ان ذمہ داریوں میں پورا اترنے کی جس کے لیے اس کی تشکیل ہوئی۔“

حضرت علامہ یہ فرما رہے تھے اور مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی کہ تحریک، بشرطیکہ اس میں جزو کا رشتہ کل، یعنی فرع کا اصل سے قائم رہے زندگی ہے۔ اس کا تقاضا ہے عمل اور اقدام۔ روحِ اتحاد و ارتباط، تعاون اور یکجہتی۔ اس کی نگاہیں مستقبل پر ہوں گی۔ برعکس اس کے فرقہ بندی جمود ہے، بلکہ افتراق و تشتت، انقطاع و انفصال، یا دوسرے لفظوں میں جزو کو کل اور فرع کو اصل کا مترادف سمجھتے ہوئے کسی ایک پر اس حد تک اصرار کہ اس سے کل اور اصل کا تصور ہی باطل ہو جائے۔ فرقہ بندی میں ماضی کی جگہ تو ہے، نہیں ہے تو حال اور مستقبل کی۔

میں یہ سوچ رہا تھا اور حضرت علامہ بھی جو گفتگو کرتے کرتے تھک گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں شاید کوئی سوال کرتا کہ انھوں نے فرمایا: ”یہ محض انگریز دشمنی کی تحریک کوئی سیاسی تحریک بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک احتجاج ہے، یا یوں کہیے کہ انگریزوں کی اسلام دشمنی کے خلاف غم و غصے کا اظہار، یہ غم و غصہ نہایت ضروری ہے بشرطیکہ جو علما محض انگریز دشمنی میں کانگریس کا ساتھ دے رہے ہیں اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور برطانوی شہنشاہیت میں جو تصادم رونما ہے اس کی سیاسی اور آئینی حیثیت کیا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ تصادم کوئی بھی شکل اختیار کرے، آئینی یا غیر آئینی، یعنی اس کی انتہا کسی بات پر ہو، اس میں وہی گروہ کامیاب ہوگا جو اندرونی طور پر مستحکم ہے اور جس کا اپنا کوئی واضح نصب العین ہے۔“

فرمایا: ''اربابِ دیوبند ہوں، یا علما کی کوئی دوسری جماعت، میرے دل میں ان کے جذبۂ آزادی، ان کی انگریز دشمنی اور دین کے لیے غیرت وحمیت کی بڑی قدر ہے۔ لیکن ان میں سوجھ بوجھ اور سیاسی بصیرت کا فقدان ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ ہندو اربابِ سیاست آزادی اور شہنشاہیت دشمنی کے پردے میں کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ انھیں چاہیے اس حقیقت کی تہ تک پہنچیں کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ آئینی ہی رہے گا۔ اس لیے تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ ہم بھی اس میں وہ جگہ پیدا کریں جو ہمارے شایانِ شان ہے۔ ہمیں اپنی تہذیب وتمدن اور طریقِ زندگی کی حفاظت مقصود ہے۔ کانگریسی خیال علما جس روش پر چل رہے ہیں اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوگا۔ ان کا اندازِ فکر سلبی ہے۔''

حضرت علامہ نے حقے کے دو ایک کش لیے۔ ہم بیٹھے ان کے ارشادات سن رہے تھے۔ جی چاہتا تھا حضرت علامہ آرام فرمائیں، لیکن انھوں نے تھوڑی دیر ستا کر پھر فرمایا: ''البتہ سرسیّد اس نکتے کو خوب سمجھے۔ انھوں نے نہایت صحیح کہا کہ مجھے ایسے آئین سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں میرا کوئی حصہ نہیں، یا اگر کہنے کو ہے بھی تو اپنا حق منوا سکوں نہ اسے چھننے سے روک سکوں۔[۲۴] اربابِ دیوبند اگر ماضی ہی پر نظر ڈالیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ کانگریس نے آج سے پچیس سال پہلے جس آئینی جدوجہد کی ابتدا کی تھی، آزادیِ ہند کا مطالبہ اس جدوجہد کی مرحلہ بہ مرحلہ کامیابی کی آخری شکل ہے۔ لیکن اس کی روح اور اساس وہی ہے [illegible] کے پیشِ نظر سرسیّد نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم کانگریس سے الگ رہیں۔ کانگریس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی، یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے جو دراصل ہندو قومیت ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ ہندوستانی قومیت کا اقرار اُمت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے۔''

ارشاد ہوا: ''یہ سب حقائق اس وقت دبے دبے تھے، لیکن جیسے جیسے اس لادین سیاست کے خدوخال اُبھرنے لگے جس کی ابتدا انگریزی حکومت نے محض اپنے مفاد کے پیشِ نظر، یا اپنے مخصوص آئینِ سیاست سے مجبور ہوتے ہوئے کی یہ حقائق بھی رفتہ رفتہ منظرِ عام پر آتے گئے اور اب تمام وکمال ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے۔ ہمیں طے کرنا ہے کہ ہم جغرافی قومیت کا اُصول تسلیم کر لیں، یا جیسا کہ اسلام کا تقاضا ہے اپنا ملی اور

سیاسی وجود قائم رکھیں۔ جغرافی قومیت میں اسلام کی حیثیت محض ایک نظام اخلاق کی رہ جائے گی، جس کی انتہا بہت ممکن ہے لادینی پر ہو۔"

ارشاد ہوا: "یا پھر مسلمان ہندو اکثریت سے دب کر رہ جائیں گے، یعنی ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی اختیار کر لیں گے۔"

چودھری صاحب شاید کچھ کہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسیّد کا نام لیا تو حضرت علامہ نے قدرے سکوت کے بعد فرمایا: "سرسیّد کی رائے نہایت صائب تھی۔ سرسیّد نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے۔ سرسیّد کو علما نے کیا کچھ نہیں کہا: کافر، ملحد کرسٹان۔ لیکن سرسیّد کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب وتمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں۔"

ارشاد ہوا: "یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی[۲۴] اور قوم کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔"[۲۵]

ارشاد ہوا: "دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل...... وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے۔ یہ ضرورت پوری ہوئی...... اور یوں بھی اس کا ہونا ضروری تھا...... لیکن دیوبند کو چاہیے تھا اسی روش پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا۔ دیوبند کدھر جا رہا ہے۔ مولانا حسین احمد یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔"

حضرت علامہ نے یہ فرمایا تو وہ جو انھوں نے کہا تھا کہ دیوبند بھی انگریزی حکومت کی غیر ارادی تخلیق ہے میری سمجھ میں آ گیا، حالانکہ مجھے تعجب تھا کہ دیوبند، جو انگریزی اقتدار پر کبھی راضی نہ ہوا، جس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ جیسے بھی حالات ہوں انگریزی حکومت کے خلاف کوئی نہ کوئی اقدام ہوتا رہے[۲۶] اسے انگریزی حکومت کی کسی تخلیق سے ارادی ہو یا غیر ارادی کیا تعلق۔ علی گڑھ بھی تو انگریزی حکومت کی ارادی تخلیق نہیں تھا۔ پھر آخر دونوں میں فرق کیا ہے؟ لہٰذا میں کچھ سمجھا تو یہ کہ حکومت ایک فن ہے اور بحیثیت ایک فن اس کا تقاضا یہ کہ حاکم محکوم کے ہر قول وفعل پر نظر رکھے، اس کے ہر اقدام کا باحتیاط جائزہ لے، اس کے نفع ونقصان

سیاسی وجود قائم رکھیں۔ جغرافی قومیت میں اسلام کی حیثیت محض ایک نظام اخلاق کی رہ جائے گی، جس کی انتہا بہت ممکن ہے لادینی پر ہو۔''

ارشاد ہوا: ''یا پھر مسلمان ہندو اکثریت سے دب کر رہ جائیں گے، یعنی ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی اختیار کر لیں گے۔''

چودھری صاحب شاید کچھ کہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسیّد کا نام لیا تو حضرت علامہ نے قدرے سکوت کے بعد فرمایا: ''سرسیّد کی رائے نہایت صائب تھی۔ سرسیّد نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے۔ سرسیّد کو علما نے کیا کچھ نہیں کہا: کافر، ملحد کرسٹان۔ لیکن سرسیّد کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا۔ وہ جب تعلیم پر زور دیتے، تہذیب وتمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں۔''

ارشاد ہوا: ''یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی [۲۴] اور قوم کے قوائے علم وعمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔'' [۲۵]

ارشاد ہوا: ''دیوبند ایک ضرورت تھی۔ اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل...... وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے۔ یہ ضرورت پوری ہوئی...... اور یوں بھی اس کا ہونا ضروری تھا...... لیکن دیوبند کو چاہیے تھا اسی روش پر قائم رہتا، سیاست کے چکر میں نہ آتا۔ دیوبند کدھر جا رہا ہے۔ مولانا حسین احمد یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔''

حضرت علامہ نے یہ فرمایا تو وہ جو انھوں نے کہا تھا کہ دیوبند بھی انگریزی حکومت کی غیر ارادی تخلیق ہے میری سمجھ میں آ گیا، حالانکہ مجھے تعجب تھا کہ دیوبند، جو انگریزی اقتدار پر کبھی راضی نہ ہوا، جس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ جیسے بھی حالات ہوں انگریزی حکومت کے خلاف کوئی نہ کوئی اقدام ہوتا رہے [۲۶] اسے انگریزی حکومت کی کسی تخلیق سے ارادی ہو یا غیر ارادی کیا تعلق۔ علی گڑھ بھی تو انگریزی حکومت کی ارادی تخلیق نہیں تھا۔ پھر آخر دونوں میں فرق کیا ہے؟ لہٰذا میں کچھ سمجھا تو یہ کہ حکومت ایک فن ہے اور بحیثیت ایک فن اس کا تقاضا یہ کہ حاکم محکوم کے ہر قول وفعل پر نظر رکھے، اس کے ہر اقدام کا باحتیاط جائزہ لے، اس کے نفع ونقصان

سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ اس کی ایک دوسری سبق آموز مثال 'قادیانی تحریک' ہے، جو از خود مسلمانوں میں پیدا ہوئی، لیکن جب اس نے بالارادہ حکومت کی طرف قدم بڑھایا اور سرکار انگلشیہ کی مدح وتوصیف کو ایک طرح سے اپنا مذہبی فریضہ ٹھہرایا تو حکومت نے بھی اس کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔ لہٰذا ارادی ہو یا غیرارادی، حکومت کی طرف سے کسی تحریک کی تخلیق کا میں جو مطلب سمجھا یہی کہ کوئی بھی حکومت ہو، وہ محکوموں کے لیے جس قسم کے حالات پیدا کرتی ہے محکوموں کی جانب سے بھی اس کا ردعمل مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اندر بھی کئی ایک تحریکیں سراُٹھاتی ہیں، کچھ حکومت کے اشارے سے، کچھ محض اس کی خوشنودی کے لیے گو اس قسم کی تحریکوں کا ذکر ہی بے سود ہے۔ ظاہر ہے حکومت انھیں خاطر میں نہیں لائے گی۔ لیکن وہ کسی ایسی تحریک سے بھی تعرض نہیں کرے گی جس سے محکوموں میں از سرِنو زندگی پیدا ہوسکتی ہے، تاآنکہ وہ اس سے تصادم پر نہ اُتر آئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا وہ اس پر نظر رکھتے ہوئے بہ احتیاط اسے آگے بڑھنے کا موقع دے گی۔ کچھ یہ خیالات تھے جو حضرت علامہ کے ارشاد سے میرے دل میں پیدا ہوئے۔ یہ انگریزی حکومت تھی جس کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل علی گڑھ اور دیوبند کی شکل میں ہوا۔ انگریزی حکومت نے جو حالات پیدا کیے اور ان سے اسلامی سیاست کا رُخ جس طرح متعین ہوا اس میں علی گڑھ کی توجہ ہمارے وجود ملی کے تحفظ پر ۔ دیوبند کی انگریزی شہنشاہیت کی مزاحمت پر۔ یوں عارضی طور پر ان کے راستے ایک رے سے مختلف ہوگئے۔

297

حضرت علامہ لیٹ گئے۔ قریشی صاحب ان کے ہاتھ سہلانے لگے۔ رحما اور دیوان علی پاؤں داب رہے تھے۔ ہمارے ذہن میں بھی ایک کے بعد دوسرا سوال پیدا ہورہا تھا۔ جی چاہتا تھا حضرت علامہ سے گفتگو کیے جائیں، ان کے ارشادات سے مستفیض ہوں، لیکن مصلحت یہی تھی کہ خاموشی اختیار کی جائے اور حضرت علامہ زحمت گفتگو نہ فرمائیں، آرام کریں۔

علی بخش چائے لے آیا۔ چائے کا دور شروع ہوا تو حضرت علامہ کے ارشادات کی رعایت سے سنی، شیعہ، وہابی اور قادیانی فرقہ بندیوں پر تبصرہ ہونے لگا۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ''مسلمانوں کے لیے اس وقت دو خطرے ہیں، ایک جغرافی قومیت، دوسرا وحدت اُمت کی نفی۔ پہلا خطرہ مغرب کے الحاد پرور خیالات، مغربی تہذیب وتمدن کے اثر ونفوذ اور نئی تعلیم کا پیدا کردہ

سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اس کی ایک دوسری سبق آموز مثال 'قادیانی تحریک' ہے، جو از خود مسلمانوں میں پیدا ہوئی، لیکن جب اس نے بالارادہ حکومت کی طرف قدم بڑھایا اور سرکار انگلشیہ کی مدح و توصیف کو ایک طرح سے اپنا مذہبی فریضہ ٹھہرایا تو حکومت نے بھی اس کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔ لہٰذا ارادی ہو یا غیر ارادی، حکومت کی طرف سے کسی تحریک کی تخلیق کا میں جو مطلب سمجھا یہی کہ کوئی بھی حکومت ہو، وہ محکوموں کے لیے جس قسم کے حالات پیدا کرتی ہے محکوموں کی جانب سے بھی اس کا ردِ عمل مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اندر بھی کئی ایک تحریکیں سر اُٹھاتی ہیں، کچھ حکومت کے اشارے سے، کچھ محض اس کی خوشنودی کے لیے گو اس قسم کی تحریکوں کا ذکر ہی بے سود ہے۔ ظاہر ہے حکومت انھیں خاطر میں نہیں لائے گی۔ لیکن وہ کسی ایسی تحریک سے بھی تعرض نہیں کرے گی جس سے محکوموں میں از سرِ نو زندگی پیدا ہو سکتی ہے، تا آنکہ وہ اس سے تصادم پر نہ اُتر آئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا وہ اس پر نظر رکھتے ہوئے بہ احتیاط اسے آگے بڑھنے کا موقع دے گی۔ کچھ یہ خیالات تھے جو حضرت علامہ کے ارشاد سے میرے دل میں پیدا ہوئے۔ یہ انگریزی حکومت تھی جس کے خلاف مسلمانوں کا ردِ عمل علی گڑھ اور دیوبند کی شکل میں ہوا۔ انگریزی حکومت نے جو حالات پیدا کیے اور ان سے اسلامی سیاست کا رُخ جس طرح متعین ہوا اس میں علی گڑھ کی توجہ ہمارے وجودِ ملی کے تحفظ پر رہی۔ دیوبند کی انگریزی شہنشاہیت کی مزاحمت پر۔ یوں عارضی طور پر ان کے راستے ایک سرے سے مختلف ہو گئے۔

حضرت علامہ لیٹ گئے۔ قریشی صاحب ان کے ہاتھ سہلانے لگے۔ رحما اور دیوان علی پاؤں داب رہے تھے۔ ہمارے ذہن میں بھی ایک کے بعد دوسرا سوال پیدا ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا حضرت علامہ سے گفتگو کیے جائیں، ان کے ارشادات سے مستفیض ہوں، لیکن مصلحت یہی تھی کہ خاموشی اختیار کی جائے اور حضرت علامہ زحمتِ گفتگو نہ فرمائیں، آرام کریں۔

علی بخش چائے لے آیا۔ چائے کا دور شروع ہوا تو حضرت علامہ کے ارشادات کی رعایت سے سنی، شیعہ، وہابی اور قادیانی فرقہ بندیوں پر تبصرہ ہونے لگا۔ حضرت علامہ نے فرمایا: "مسلمانوں کے لیے اس وقت دو خطرے ہیں، ایک جغرافی قومیت، دوسرا وحدتِ اُمت کی نفی۔ پہلا خطرہ مغرب کے الحاد پرور خیالات، مغربی تہذیب و تمدن کے اثر و نفوذ اور نئی تعلیم کا پیدا کردہ

ہے، جسے کانگریس کی لادین سیاست طرح طرح سے ہوا دے رہی ہے اور جس کا بعض علما انگریز دشمنی کے فریب میں نادانستہ خیر مقدم کر رہے ہیں۔ دوسرا قادیانیت کی طرف سے ہے۔"

ارشاد ہوا: "ایک کی اساس لامذہبیت ہے، دوسرے کی مذہب۔ قادیانیت اُمت سے کٹ چکی ہے جس کا شاید اسے خود بھی شعور نہیں، اور ہے بھی تو بابیت اور بہائیت کے پیشِ نظر اس کے نزدیک مصلحت اسی میں ہے کہ اُمت سے اپنا رشتہ قائم رکھے۔"

پھر فرمایا: "فرض کیجیے قادیانیت کی سوادِ اعظم سے علیحدگی اُمت کی سیاسی اجتماعی نصب العین سے بے خبری کا نتیجہ ہے، یعنی بطور ایک نظام اجتماع و عمران اسے اسلام کے ماضی و حال کا کوئی فہم ہے، نہ مستقبل کا۔ اس کی مثال ایک انتہائی فرقہ بندی کی ہے۔ جب بھی اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے عقاید ایک عجیب و غریب ملغوبہ ہیں اسرائیلی اور مجوسی تصورات کا، جو بوجوہ طرح طرح کے چور دروازوں سے اسلام میں در آئے ہیں۔"

فرمایا: "قادیانیت کا دامن بہر حال ان حقائق سے خالی ہے جو اُصول توحید و رسالت میں کئی ایک پہلوؤں سے مضمر ہیں۔"

حضرت علامہ نے یہ فرمایا تو سوال پیدا ہوا کہ ان خطرات کے سد باب کی صورت کیا ہو؟ اب ہم آپس باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی حضرت علامہ سے بھی سوال کر لیتے۔ ہر چند یہ معالجین کا اصرار تھا کہ ان سے حتی الوسع گفتگو نہ کی جائے، لیکن حضرت علامہ کوئی سلسلۂ گفتگو چھیڑیں تو اسی کا جاری رکھنا ضروری ہو جاتا۔ جاری نہ رکھنے کا مطلب ہوتا بے اعتنائی، بلکہ گستاخی، جس کی ظاہر ہے ہم میں سے کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ معالجین کا اصرار بیشک اپنی جگہ پر درست تھا کہ حضرت علامہ کو گفتگو سے احتراز کرنا چاہیے، ان کا قلب متاثر ہے، لیکن ہم انھیں گفتگو سے کیسے روک سکتے تھے۔ ان کا بدن مضمحل سہی، دل و دماغ تو مضمحل نہیں تھے۔ وہ زندوں کی طرح جینا چاہتے تھے۔ محض جیے جانا ان کے نزدیک زندگی نہیں تھی۔ وہ ابن سینا کا یہ قول اکثر دہراتے "ما عرض حیات می خواہیم، طول حیات نمی خواہیم"۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا راستہ وہ نہیں تھا جو شیخ الرئیس کا۔ ابن سینا کے سامنے صرف اپنی ذات تھی۔ حضرت علامہ کا دل و دماغ اُمت پر مرکوز تھا۔ انھیں اس کے مستقبل تو کہیں رہا وجود کی فکر تھی۔ وہ خاموش کیسے رہ سکتے۔ خاموشی کا مطلب ہوتا یاس، بے دلی، قوم کے مستقبل سے نامیدی۔ بقول مرزا غالب:

۱۷- ایضاً۔

۱۸- دولتِ عثمانیہ کے خلاف۔ آلِ سعود نے جنوب مشرقی عرب میں خروج کیا تو ان علاقوں میں برطانیہ کو اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ اس سلسلے میں دیکھیے نجد میں مسٹر بلنٹ (Blunt) کا سفر۔ ظاہر ہے بلنٹ اور مسز بلنٹ کا نجد سے یہ تعلق خالی از معنی نہیں تھا۔

۱۹- سرزمین نجد میں اور یوں بھی کہ اس طرح رسوم و بدعات کے خلاف عام احتجاج کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

۲۰- جس میں یورپ کے سیاسی حلقے اور مستشرقین بھی سرگرم کار رہے اور افسوس یہ ہے کہ بالآخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوگئے۔ عالمِ اسلام کے ذہنی افتراق، ماضی کے غلط تصور اور نسلی اور وطنی تعصّبات، حتیٰ کہ وطنی اور جغرافی قومیت ایسی تحریکوں کو انھیں کی ریشہ دوانیوں سے تقویت پہنچی۔

۲۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، خطبہ چہارم۔

۲۲- بطور ایک عالمگیر جمعیت بشری کے۔

۲۳- عام خیال تو یہی ہے کہ سیّد جمال الدین افغانی نے اتحاد (جامعہ) اسلامی (Pan Islamism) کے نام سے جو تحریک اُٹھائی تھی ناکام رہی۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خیال ہے بھی ٹھیک۔ عالمِ اسلام نے بجز ایک استثنا (پاکستان) کے ہر کہیں اسلام کے بجائے وطنی تصور قومیت (Territorial Nationalism) کو اُصولِ سیاست ٹھہرایا۔ مغربی انداز معاشرت اختیار کرلیا۔ بایں ہمہ یہ تحریک کامیاب رہی۔ اس کی روح تھی اسلام کا تصور سیاست، لہٰذا وحدت اُمت پر اصرار۔ بالفاظ دیگر اُمت کا غیر اسلامی عناصر سے استخلاص، سیاسی، اجتماعی، اخلاقی ہر لحاظ سے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کا احیا اور عالمِ اسلام کی نشاۃ الثانیہ اسلام کے نظام مدنیت کی بنا پر۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مصر، ایران اور ترکیہ نے استبداد اور مطلق العنانی کے خلاف قدم اُٹھایا۔ ان میں حریت اور آزادی کی روح بیدار ہوئی۔ یہ اس تحریک کے اولین اثرات تھے۔ جدید دنیا میں عالمِ اسلام کو بمقابلہ مغرب جو مسائل پیش آرہے ہیں...... وہ مسائل جن کی نوعیت سیاسی بھی ہے، ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی بھی...... ان کے خدو خال اب نمایاں ہورہے ہیں بالخصوص اس تصادم کے زیر اثر جو باعتبار تہذیب وتمدن اسلام اور مغربی طرز زندگی میں رونما ہے۔ لہٰذا ہمارا ذہن پھر اس تحریک کی طرف منتقل ہورہا ہے۔

۲۴- حضرت علامہ گویا سرسیّد کے ان الفاظ کو کہ ”جس طریق نمایندگی میں میری قوم کے ہاتھ بمقابلہ دوسری قوم کے کم ہوں میرے لیے قابلِ قبول نہیں“ ایک دوسرے انداز میں دہرا رہے تھے۔

۲۵- ان معنوں میں کہ سرسیّد نے جس تحریک کی ابتدا کی اور ان کے رفقا نے اسے جس طرح آگے بڑھایا اگرچہ بظاہر حصول تعلیم تک محدود تھی، لیکن یہی تحریک ہے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہماری ساری [illegible]گی متاثر ہوئی، ہمارا ذہن بدلا، خیالات بدلے، حتیٰ کہ مذہب ہو یا اخلاق، سیاست یا معاشرت، ہر

خاموش اور پریشان کھڑا ہے لیکن میاں صاحب مسکرا رہے ہیں اس لیے کہ مسلمانوں کے اتحاد پر ضرب لگائی تو انھوں نے۔ اشتہار کا عنوان تھا: Who has been at my Eno? شنکر کا، کارٹون؟

Who has been at Muslim solidarity

۱۰- کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہ و صوفی و ملا کی کہنہ ادارکی

ضرب کلیم

۱۱- نانوتوی، بانی مدرسہ دیوبند، ولادت ۱۸۳۲ع بمقام نانوتہ، ضلع سہارن پور، وفات ۱۸۸۰ء، مولوی مملوک علی اور حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد، جن سے سرسیّد کو بھی نیاز حاصل تھا۔ مدرسۂ دیوبند کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی۔

۱۲- دیکھیے مکتوبات سرسید، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۲۴ تا ۲۷۔ مرتب مکتوبات یعنی شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے نزدیک یہ خط غالباً ۱۸۶۷ء میں لکھا گیا جس کا مفصل جواب مولانا کی تصنیف تصفیۃ العقاید میں موجود ہے۔ یہ خط پیر محمد عارف صاحب کے توسط سے مولانا کو پہنچا۔ سرسیّد اس وقت بنارس میں صدر الصدور تھے۔ سرسیّد نے اپنے پندرہ عقاید فہرست وار بیان کیے ہیں۔ تصفیۃ العقاید میں علاوہ اس کے کہ سیّد صاحب کے معتقدات سے مولانا نے جس طرح بحث کی ہے ان کا خط بھی موجود ہے جو انھوں نے پیر محمد عارف صاحب کو لکھا اور درخواست کی تھی کہ اسے سرسیّد تک پہنچا دیں۔ مولانا نے سرسیّد کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کیا ہے۔

۱۳- ان معنوں میں کہ اگرچہ اعمال اور عقاید کا احتساب ضروری ہے، فرد اور جماعت دونوں کے لیے، تاکہ ہم ایک دوسرے کو ہر ایسے عقیدے اور ہر ایسے طرزِ عمل پر متنبہ کر سکیں جس سے کفر کا احتمال ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اندریں صورت ہم فی الواقع کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ تو گویا افہام و تفہیم کا معاملہ ہے جسے فقہا نے اصطلاحاً بجا طور پر ''کفر دون کفر'' سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت علامہ اس تعصب اور تنگ دلی بلکہ درحقیقت اسلام سے ناواقفیت کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس کی بنا پر علما کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو کافر ٹھہراتے ہیں اور جس کی مذمت میں علامہ شبلی نے بھی ''شغل تکفیر'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ خاتمے کا شعر تھا:

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بے کار نہیں ہیں

۱۴- دیکھیے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، خطبہ اول۔

۱۵- علی گڑھ ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ جیسے بھی حالات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے مسلمان اپنے آپ کو ایک نئے مستقبل کے لیے تیار کریں: سیاسی، اجتماعی، ذہنی، ہر اعتبار سے۔

۱۶- محمد بن عبدالوہاب نے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، چھٹا خطبہ۔

سہ شنبہ: ۸ر مارچ

علی الصبح حاضر خدمت ہوگیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت علامہ کی طبیعت بہتر رہی، ورنہ ڈر تھا رات کی گفتگو سے ان کے قلب پر کوئی خراب اثر نہ پڑے۔ قرشی صاحب بھی اسی خیال سے صبح سویرے ہی نبض دیکھ گئے تھے۔

اُمت کو اس وقت ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے جس سے اس کے دل و دماغ میں جلا پیدا ہو، اس کے قوائے علم و عمل بیدار ہوں، وہ اپنا راستہ صحت سے متعین کرلے۔ یہ خیالات تھے جو رات بھر میرے ذہن میں رہے اور جن کو لے کر میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت علامہ نے جیسے رات کی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''جمعیۃ العلما کیا کہ رہی ہے؟ جمعیت العلما کی رائے کہاں تک مولانا حسین احمد کے حق میں ہے؟''[1]

میں نے عرض کیا: ''بظاہر تو مولانا حسین احمد کو اس کی پوری تائید حاصل ہے، لیکن در پردہ اس کی خواہش شاید یہی ہے کہ قوم اور وطن کی بحث آگے نہ بڑھے۔ مولانا کے طرف دار صرف بات کو نباہ رہے ہیں۔''

حضرت علامہ خاموش ہوگئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمایا: ''آج کیا خبر ہے؟ کوئی تازہ خبر؟''

میں نے عرض کیا: ''کوئی خاص خبر نہیں۔ وہی خبریں ہیں جو معمولاً ہوا کرتی ہیں۔''

ارشاد ہوا: ''لڑائی کب ہوگی؟''

لڑائی کب ہوگی؟ لڑائی! لڑائی! حضرت علامہ روز دریافت فرماتے ہیں لڑائی کب ہوگی؟ جیسے لڑائی قریب آگئی ہے! انھیں ہر روز انتظار رہتا ہے لڑائی کی خبر سنیں۔ دراصل حضرت علامہ اپنی بصیرت کی بنا پر خوب اندازہ کر چکے ہیں کہ اقوام یورپ کا تصادم ناگزیر ہے۔ جنگ ہوگی اور امروز و فردا میں ہوگی۔ وہ سوچتے ہیں کہ جنگ سے جو نسلی اور قومی طوفان اُٹھے گا اس کا اثر

پہلو سے ماضی و حال اور مستقبل پر نئے سرے سے غور کیا گیا۔ پھر اس ایک تحریک سے کئی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ایک نیا ادب اور نئی زبان وجود میں آئی، علم و عمل کے راستے کھل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے معاشرے نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئی شکل اختیار کر لی، جس میں تبدیلی حکومت کے علاوہ اگرچہ ان عوامل کا بھی دخل ہے جو باہر سے آئے تھے، لیکن جس میں ہم اس کے اندرونی عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

۲۶- مثلاً دیوبند کا وہ اقدام جسے انگریزی حکومت نے ''ریشمی رومال کی سازش'' سے موسوم کیا اور جس کی بنا پر حضرت شیخ الہند، مولانا محمود الحسن اور مولانا حسین احمد کو مالٹا میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں۔ دیکھیے مولانا حسین احمد کی تصنیف اسیران مالٹا۔

۲۷- اور جس سے قارئین کا ذہن شاید ان کے اس شعر کی طرف منتقل ہو جائے:

بذکر مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست   گرت فسانۂ غالب شنیدن است مخسپ

اور پھر شاید غالب ہی کی زبان میں حضرت علامہ کی شب زندہ داری سمجھ میں آ سکے۔ مرزا نے کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے:

زدیدہ سود حریفاں کشودن است مہند   ز دل مراد عزیزاں تپیدن است مخسپ

ترک و عرب، ایرانیوں اور افغانوں پر کیا پڑے گا، ان مسلمانوں پر جو سرِ دست دوسروں کی رعایا ہیں۔ حضرت علامہ کا یہ خیال تو نہیں ہے کہ جنگ کی صورت میں عالمِ اسلام کی نشاۃ الثانیہ ناگزیر ہے، لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اتحاد و اتفاق اور فہم و بصیرت سے کام لیا تو اس طرح کی کسی نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ناممکن بھی نہیں۔

حضرت علامہ پھر خاموش ہو گئے۔ اتنے میں نیو ٹائمز[۲] آ گیا۔ میں نے حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق اس کی موٹی موٹی سرخیاں پڑھ کر سنائیں۔ حضرت علامہ کا کچھ ایسا ہی معمول تھا کہ اگر کسی سرخی میں کوئی بات ہوئی تو دو چار جملے اور سن لیتے ورنہ اخباروں سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی اِلّا یہ کہ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری بیان، مضمون یا اطلاع ان کی توجہ اپنی طرف منتقل کر لے، مثلاً کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق مسلمانوں کے مستقبل سے ہے، میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ علی بخش چائے لے آیا۔ حضرت علامہ نے کتابوں کے ایک بقچے کی طرف جو پلنگ کے پاس ہی رکھا تھا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ بقچہ کسی مولوی کی نذر کر دو۔''

میں نے عرض کیا' بہت بہتر۔ پھر دریافت کیا' یہ کتابیں کیسی ہیں؟ کیا دینیات سے متعلق ہیں؟

حضرت علامہ نے فرمایا'' شاہ صاحب[۳] کے کچھ رسائل ہیں، تصوف میں۔'' پھر فرمایا: ''غیر ضروری اور لا حاصل۔''[۴]

یہ رسائل چند دنوں سے حضرت علامہ کے مطالعے میں تھے اور انھیں شاہ صاحب کی بعض تصنیفات کی بھی طلب تھی۔ میں نے حضرت علامہ کے ان الفاظ ''غیر ضروری اور لا حاصل'' کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، کچھ تو اس خیال سے کہ شاہ صاحب نے ان رسائل میں شاید زیادہ تر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود ہی کی بحث چھیڑی ہے اور کچھ اس لیے کہ حضرت علامہ کی رائے تصوف کے باب میں بنیادی طور پر بدل چکی ہے۔ تصوف کی حقیقت ان کے نزدیک بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ اُصولاً ایک عمل ہے واردات باطن کی تنقید اور تزکیہ کا اور مقصد احکامِ شریعت کا مشاہدہ اعماق حیات میں۔ بعینہٖ جیسے سائنس ایک عمل ہے اس مادی عالم کے متعلق ہمارے محسوسات و مدرکات کی تنقید اور تزکیے کا۔ لہٰذا اس کے سرتاسر خارجی تصور کا۔[۵]

حضرت علامہ نے چائے پی اور خود ہی فرمایا: ''شاہ صاحب کی شخصیت بڑی عظیم ہے، مگر ان کی حقیقی عظمت کا اظہار حجۃ اللہ البالغہ میں ہوا۔ باقی تصنیفات بھی غنیمت ہیں، لیکن

پھر فرمایا: ''احیا العلوم بڑی چیز ہے۔ اس کی علمی اور فلسفیانہ قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ غزالی بہت بڑا انسان تھا۔''

ابن رشد کا ذکر آ گیا۔ شاید یوں کہ چودھری صاحب، یا غالباً راجا صاحب نے کہا ہمارے ذہن میں ان بزرگوں کا تصور کچھ ویسے ہی قائم کر دیا گیا ہے جیسے عام طور پر علمائے دین کا، حالانکہ انھیں علوم و فنون میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ اس پر قرشی صاحب نے کہا 'ابن رشد ہی کو دیکھیے، وہ طبیب بھی تھا۔''

فرمایا: ''ابن رشد ارسطو کا شاگرد ہے۔ وہ ارسطو سے خوب واقف تھا، لیکن اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔[۱۰] غزالی کی شخصیت اس کے مقابلے میں بڑی عظیم ہے۔ دراصل ابن رشد کی عظمت کا راز ہے اس کی طبّی اور فقہی حیثیت[۱۱] فلسفہ میں ارسطو نے اسے اُبھرنے نہیں دیا[۱۲] گو یورپ اس سے متاثر ہوا۔ پاڈوآ[۱۳] ابن رشد کی تعلیم کا خاص مرکز تھا۔

فرمایا ''احیا'' کی تصنیف سے فکر انسانی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے۔ تہافت کو اس کا مقدمہ کہیے[۱۴] وہ فکر انسانی کا ایک اچھوتا مظہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالی کے مقاصد مذہبی تھے، لیکن فکر کی تنقید میں انھوں نے جو منہاج وضع کیا اس کے لیے فلسفہ ہمیشہ ان کا [illegible] منت رہے گا۔ یہ منہاج وضع نہ ہوتا تو عقل و فکر کا قدم آگے نہ بڑھتا۔ غزالی کا مذہبی درجہ ...بلند ہے، لیکن فلسفیانہ حیثیت سے بھی ہم ان کی ذہانت اور طباعی سے انکار نہیں کر سکتے۔''

قرشی صاحب نے کہا ''مولانا شبلی کی رائے ہے کہ اگر احیا کا ترجمہ کسی مغربی زبان میں ہو گیا ہوتا تو لوگ کہتے دیکارت[۱۵] کے افکار غزالی سے ماخوذ ہیں بلکہ شاید احیا کا سرقہ۔''

میں نے عرض کیا ''جدید فلسفہ کی ابتدا دیکارت سے کی جاتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ابتدا جس منہاج سے ہوئی وہ مسلمانوں کا وضع کردہ ہے۔''

فرمایا ''یہ ٹھیک ہے، اس لیے کہ فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو دیکارت کے مباحث وہی ہیں جو غزالی کے، لیکن ہوسکتا ہے غزالی کے یہ مباحث کسی دوسرے ذریعے سے، یعنی بالواسطہ یورپ میں پہنچے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ایک طرح سے تہافت ہی کا سرقہ کیا ہو۔ اسلامی افکار کے نفوذ و اشاعت میں ابھی ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔''[۱۶]

❁.......❁.......❁

نے ابن رشد سے بہت کم اعتنا کیا۔ سوال ہے کیوں؟

۱۳- Padua ایطالیہ میں۔ یہ معلوم ہے کہ اٹلی اور فرانس میں ابن رشد کے اتباع میں جو فلسفیانہ تحریک پھیلی اس نے ایک حد تک مذہبی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مسیحی کلیسا کو اس تحریک کے رد میں بڑی سر توڑ کوششیں کرنا پڑیں۔

۱۴- احیا العلوم والدین اور تہافت الفلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵- Descartes، فرانسیسی فلسفی، فلسفۂ جدید کا آدم۔ اس کا منہاج ہے تشکک، مثبت تشکک جس کی انجا بالآخر اثبات ذات پر ہوئی۔

۱۶- یوں بھی کہ علاوہ ان تصنیفات کے جن کا ترجمہ لاطینی اور پھر لاطینی سے کسی دوسری زبان میں ہوا، بعض ایسی تصنیفات کے متعدد اقتباسات بھی ملتے ہیں جن کے لاطینی یا لاطینی سے مغرب کی دوسری زبانوں میں ترجمے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

پھر عجیب بات ہے کہ دیکارت نے بظاہر گو امام غزالی کا مطالعہ نہیں کیا...... نہ براہ راست، نہ کسی دوسرے ذریعے سے...... بایں ہمہ اب یہ خیال روز بروز تقویت حاصل کر رہا ہے کہ اس نے حضرت امام سے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ لہٰذا اس کا منہاج بھی دراصل غزالی کا منہاج ہے۔ پھر اس سے بھی اہم تر حقیقت یہ کہ دیکارت کے منہاج کی حیثیت محض 'تاریخی' ہے، چنانچہ آگے چل کر اس پر اعتراضات ہوئے اور اس کا رد بھی کیا گیا۔ برعکس اس کے امام صاحب کا منہاج فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ دونوں پہلوؤں سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔

گھنٹی بجی۔ حضرت علامہ علی بخش کو بلا رہے تھے۔ میں بھی علی بخش کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حضرت علامہ حسبِ معمول بڑے مطمئن تھے۔ روزِ مرہ کے عوارض کے علاوہ کسی خاص تکلیف کی شکایت نہیں تھی۔ مگر یہ روزِ مرہ کے عوارض کیا کم ہیں، سانس کی مسلسل تکلیف اور اس تکلیف کے باعث انھیں کبھی ایک کروٹ کے بل لیٹنا پڑتا ہے کبھی دوسری کے۔ کبھی گاؤ تکیے پر سر ٹیک کر اوندھے لیٹ جاتے ہیں۔ یوں ذرا آرام ملا تو سیدھے بیٹھ گئے، یا پھر تکیوں سے کمر ٹیک لی۔ یہ تکلیفیں ہیں جن کا دورہ ویسے تو نسبتاً ذرا دیر دیر سے ہوتا ہے اور شدت میں بھی کمی ہے، لیکن جب تک ان کا ازالہ نہ ہوجائے مرض کا انسداد کیسے ہوسکتا ہے؟ حضرت علامہ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ بڑی تشویش اور پریشانی ہے۔

مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ حضرت علامہ کا ذہن ابھی تک اس مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا، یا شاید چودھری صاحب سے یہی گفتگو ہورہی تھی۔ بہرحال میں نے حضرت علامہ سے مزاج پوچھا اور انھوں نے طبیعت کے بارے میں اظہار اطمینان کرتے ہوئے سلسلۂ گفتگو کو جو میری آمد پر منقطع ہوگیا تھا، جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''کسی قوم کا اتحاد ختم ہوجائے تو اس کی قدرتاً آرزو ہوتی ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی وحدت پھر سے حاصل کرلے۔ یوں ہی اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں ہی اس کا زوال و انتشار، طاقت اور جمعیت سے بدل سکتا ہے۔ بغیر اس کے نہ اس کی حفاظت کا کوئی ذریعہ ہے، نہ سلامتی ۔ لیکن یہ وحدت پھر سے پیدا ہوگی تو اسی اُصول کی بدولت جس پر اول اول اس کی اساس ری گئی اور جس کا اظہار حیاتِ ملّی کی مخصوص شکل میں ہوا۔ یہ بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس کے لیے کوئی دوسری اساس تلاش کریں، جیسا کہ ہمارے اربابِ سیاست کر رہے ہیں۔ ناممکن ہے مسلمان اس طرح متحد ہوسکیں۔''

ارشاد ہوا: ''یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ لوتھر کی تحریک نے اہلِ مغرب کی وحدت پارہ پارہ کردی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عسائیت یا عسائیت کے علاوہ بعض اور عوامل بھی تھے جنھوں نے اتحاد مغرب میں حصہ لیا۔ بحث یہ ہے کہ یہ اتحاد جیسا بھی تھا ختم ہوگیا اور اس کے بجائے نسلیت اور وطنیت نے سر نکالا۔ اقوام یورپ الگ الگ گروہوں میں بٹ گئیں۔''

فرمایا: ''اس کے باوجود یورپ کی خواہش ہے کہ اس کا اتحاد قائم رہے۔ لیکن یہ اتحاد ہے

بظاہر وہ طاقت کا پرستار اور جنگ کا داعی ہے، لیکن بباطن ایک جدید نظام اجتماع کا علمبر دار۔[۲] اس کی کوششیں بھی نپولین کی طرح رائگاں گئیں۔[۳] انجمن اقوام بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے، لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہے گی۔"[۴]

میں نے عرض کیا "آپ نے پہلے بھی فرمایا تھا کہ نیٹشے اس جنگ کو روکنا چاہتا تھا جس کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ اس کی آرزو تھی اہلِ یورپ متحد رہیں۔ لیکن اتحاد یورپ کی یہ خواہش اگر کسی اعلیٰ یعنی خالصۂ انسانی مقصد پر مبنی ہوتی تو وہ اسے یورپ تک محدود نہ رکھتا۔ اس نے ہمیشہ اچھے مغربیوں[۵] کا ذکر کیا ہے، جیسے یورپ کے علاوہ کہیں اچھوں کا وجود ہی نہیں، یا اگر ہے تو جس نظام یا دستور حیات کا تصور نیٹشے نے قائم کر رکھا تھا اس میں دوسروں کی کوئی جگہ نہیں۔ یہ اَمر تو اتحاد انسانی بلکہ نیٹشے کے بنیادی فکر کے منافی ہے۔"

فرمایا: "اس کی خواہش تو بہر حال یہی تھی کہ اہلِ یورپ متحد ہو جائیں۔"

میں نے کہا "تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ نیٹشے کی رائے میں انسان کا مستقبل صرف یورپ سے وابستہ ہے۔"

ارشاد ہوا: بہت ممکن ہے، وہ ایسا ہی سمجھتا ہو۔"

سلسلۂ گفتگو پھر مسلمانوں کے اتحاد اور اتحاد سے متحدہ قومیت کے طرفداروں اور کانگریس کے ہم نوا علما کی طرف پھر گیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا: "وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تعلیم و تربیت سے مجبور ہیں۔ ان کا دل و دماغ مغربی تعلیم کے زیر اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ یوں بھی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلاد اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں اُبھر رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد یا آزاد ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے۔ لہٰذا آج کل کے نوجوان اگر نشۂ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن علما کو کیا ہو گیا ہے؟ علما کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام لاوطن ہے۔"

حضرت علامہ کچھ تھک گئے تھے۔ کچھ دم کشی کی تکلیف تھی۔ ہم خاموش بیٹھے ان کے ارشادات سن رہے تھے۔ پھر خود ہی فرمایا "یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کہ اہلِ حدیث عام طور پر

کانگریس کے طرف دار ہیں۔"

ہم نے عرض کیا "عام خیال تو یہی ہے کہ اہلِ حدیث کانگریس کے طرف دار ہیں۔ شاید اس لیے کہ مولانا حسین احمد کا تعلق دیو بند سے ہے اور دیو بند کو غلط ہو یا صحیح اہلِ حدیث کا مرکز اور مستقر تصور کیا جاتا ہے۔ البتہ اہلِ حدیث کے بعض سر برآوردہ علما ضرور کانگریس کی حمایت کر رہے ہیں، مگر ذاتی حیثیت سے۔ کانگریس کو نہ تو اہلِ حدیث کی بحیثیت اہلِ حدیث تائید حاصل ہے، نہ دیو بند سے کبھی ایسا کوئی اعلان ہوا۔ بایں ہمہ سمجھ میں نہیں آتا یہ کانگریس کی حمایت میں سنی، وہابی کی تفریق کیسے قائم ہوگئی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے، کچھ حضرت علامہ کے ارشادات کے پیشِ نظر، کچھ آپس میں کہ یہ سنی، وہابی کی تفریق کیسے قائم ہوگئی۔ عقاید میں تو تھی ہی، سیاسیات میں بھی در آئی۔ حالانکہ عقاید کا اختلاف سطحی ہے اور سیاست کا مسئلہ بھی کچھ ایسا مشکل نہیں کہ آپس کا اختلاف و نزاع دور نہ ہو سکے۔ کیا اس کی وجہ ہے عقاید میں تشدد، تعصب اور تنگ نظری؟ کیا اس لیے کہ لیگ کی تحریک، تحریک علی گڑھ ہی کا ایک دوسرا نام ہے اور علی گڑھ کو غلطی سے انگریزی حکومت کی وفاداری اور اس سے تعاون کا طرف دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ برعکس اس کے دیو بند ہو یا اہلِ حدیث یا عرفِ عام میں وہابی، انگریزی حکومت ابتدا ہی سے ان سے بدگمان رہی، بالخصوص اس زمانے سے جب حضرت سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد کو وہابیت اور ان کے بچے کھچے مجاہدین کی طرف سے سرحد میں انگریزی حکومت کے خلاف صف آرائی کو 'وہابی شورشوں' سے تعبیر کیا گیا،[۱] یا اس لیے کہ کچھ انگریزی تعلیم کے اثر و نفوذ اور کچھ اس انقلاب کے باعث جو علی گڑھ نے مسلمانوں کی عام زندگی میں پیدا کیا اور جس سے ان کی سیاست ہی نہیں، ادب اور فن، افکار و تصورات اور طرزِ معاشرت تیزی سے بدلتے چلے گئے علمائے دین نے سوادِ اعظم کو تو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور خود بے تعلقی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر پھر جب تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا آغاز ہوا، انگریز دشمنی کو پھر سے ہوا دی گئی اور اس کی تائید میں علما سے رجوع لازم ٹھہرا تو وہ اس روش کو ساتھ لیے جو انھوں نے سیاست اور مذہب میں طے کر رکھی تھی پھر میدانِ عمل میں نکل آئے۔ بظاہر علی گڑھ اور دیو بند ایک ہو گئے لیکن تحریکِ ترکِ موالات ناکام رہی۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر گیا تا آنکہ ان کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے اور مسلمانوں

کل کی اصطلاح میں ہم یہ کہیں گے کہ قوم ہے تو کن معنوں میں۔ وہابیت کی یہی روش ہے جس سے برطانوی شہنشاہیت نے خوب خوب فائدہ اُٹھایا اور جیسی کہیں مصلحت تھی ویسا ہی رویہ اختیار کیا۔ مخالف بھی اور موافق بھی؟[۱۱]

فرمایا "ردِتقلید اور ازالہ بدعات گو اپنی جگہ پر ضروری تھا لیکن اس کا دائرہ چونکہ بحث ونظر سے آگے نہیں بڑھا اور جو بھی گفتگو کی گئی عقاید کے رنگ میں لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس کے سامنے حیاتِ ملّی کا صرف ایک پہلو تھا۔ بایں ہمہ اس تحریک سے کئی ایک تحریکیں پیدا ہوئیں۔ کہیں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مغرب کے غلبہ واستیلا کو روکنے کی کیا تدبیر ہے۔ کہیں یہ کہ بلاد اسلامیہ اپنی بچی کھچی آزادی کیسے برقرار رکھیں۔ کہیں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمان علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں کیسے آگے بڑھیں۔ کہیں یہ کہ معاشرے کی اصلاح کیسے ہو۔ غرض کہ اس ایک آواز سے کہ باب اجتہاد وا ہو کئی ایک آوازیں اُٹھیں اور اُمت کی توجہ کئی ایک مسائل کی طرف منعطف ہوگئی۔

قرشی صاحب اور راجا صاحب شاید کوئی سوال کرنا چاہتے تھے کہ حضرت علامہ نے قدرے ستا کر فرمایا "ذہن انسانی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ تقلید کے خلاف ایک آواز اُٹھی، اجتہاد پر زور دیا گیا۔ عالمِ اسلام نے ایک کروٹ لی اور صدیوں کے جمود وتعطل کے بعد قوائے عمل کو تحریک ہوئی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ صرف تقلید اور فقہی جمود ہی نہیں بلکہ منجملہ اس کے اور بھی کئی ایک خرابیاں ہیں جن سے اسلام کی روح پائمال ہورہی ہے۔ مثلاً ملوکیت، خانقاہی، علم وحکمت کا زوال، سیاسی اور معاشی ابتری، مغربی تہذیب اور مغربی شہنشاہیت کے غلبہ واستیلا کا بڑھتا ہوا ریلا۔

324

ارشاد ہوا "یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جب کوئی انسان جسے اللہ تعالیٰ نے دین کا فہم عطا کیا ہے اور جسے اس کے ساتھ ایمان ویقین اور عزم وحوصلے کی دولت بھی ملی ہے کسی بنیادی مسئلے کو چھیڑتا اور اُمت کو اصلاح کی دعوت دیتا ہے تو یہ دعوت کوئی بھی شکل اختیار کرے، رائیگاں نہیں جاتی۔ اس سے کئی ایک اور نتائج بھی مترتب ہوسکتے، بلکہ ہوجاتے ہیں خواہ کسی دوسرے رنگ میں۔"

ارشاد ہوا "شاہ صاحب[۱۲] ہی کو دیکھیے کیسے بالغ نظر اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دوراندیشی اور

تازہ کریں، خواہ کسی رنگ میں،''[17]

ہم نے عرض کیا لیکن یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ جہاد کے اس جذبے کا تعلق کسی مخصوص حلقے سے ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی علی گڑھ کی پیداوار تھے۔ فرنگی محل[18] سے بھی ان کا سلسلہ ارادت بہت بعد میں قائم ہوا۔

فرمایا ''بحث فرنگی محل کی ہے نہ کسی مخصوص حلقے کی، جہاد ایک طرح سے اسلام کی روح ہے اور اس لیے آزادی کی تڑپ ہر مسلمان کے سینے میں موجود ہے۔''

ہم نے عرض کیا یہ بھی ایک وجہ ہے کہ علما کا ایک طبقہ کانگریس کی طرف کیوں مائل ہے۔ ان کے لیے اس کے نعرہ آزادی اور انگریز دشمنی میں بڑی کشش ہے۔ یہ نہیں کہ انھیں وطنیت کے لادین سیاسی تصور، یا متحدہ قومیت کی تائید منظور ہو۔

فرمایا ''لیکن انگریز دشمنی کوئی مثبت اُصول نہیں نہ آزادی کے کچھ معنی جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا کہ ہم کس مقصد کے لیے آزادی حاصل کر رہے ہیں اور کس سے۔''

فرمایا ''ہندوؤں کا ایک نقطۂ نظر ہے۔ ان کے ذہن میں متحدہ قومیت کا ایک مثبت تصور ہے۔ وہ جانتے ہیں آزادی کے بعد اس تصور کی عملی تعبیر کیسے ہوگی، یعنی وہ نیا معاشرہ جو اس طرح وجود میں آئے گا اس کی تعمیر سیاسی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے کس نہج پر کی جائے گی۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں[19] کیا ان کو دیکھتے ہوئے کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ جب ملک کا اقتدار کانگریس کے ہاتھ میں آیا تو وہ اس وقت متحدہ قومیت کو جو شکل دے گی وہ اسلام کے عین مطابق ہوگی، لہٰذا ہمیں اس سے غیر مشروط تعاون پر کوئی اعتراض نہیں؟ کیا تحریک جہاد سے مقصود بھی محض انگریزوں کا اخراج تھا، کوئی مثبت نصب العین اس کے سامنے نہیں تھا؟ اور کیا دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ مذہب ہر فرد کا اپنا معاملہ ہے؟ قوموں کی تشکیل محض جغرافی حدود کے اندر سیاست اور معاش کی بنیادوں پر ہوتی ہے؟''

فرمایا ''یہ سوالات اہم ہیں، نہایت اہم۔ یہ دوسری بات ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو مغربیت کے قریب ہیں اپنے ماضی سے دور ہو چکا ہے، یا قدیم الخیال طبقہ جسے عصر حاضر کے بدلتے ہوئے تصورات کا کوئی علم نہیں ان کی اہمیت سے بے خبر ہے۔''

فرمایا ''ہندوؤں کی طرح ہمارا بھی ایک نقطۂ نظر ہے اور اس ملک کے بدلتے ہوئے

اُمت کے لیے غیرت وحمیت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ان کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واضح ہورہی ہے۔''[۱۳]

حضرت علامہ نے تکیوں کا سہارا لیا۔ کچھ دیر سکوت فرمایا لیکن ان کا جی چاہتا تھا برابر گفتگو کرتے چلے جائیں۔ ہم اگر چاہتے بھی تو انھیں اس سے روک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

''وہابی تحریک[۱۴] ایک چنگاری تھی جس سے عالمِ اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اُٹھی۔ صدیوں کا جمود ٹوٹا۔ قوائے علم و عمل مشل ہو رہے تھے۔ ان میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہیے۔''

ارشاد ہوا ''عالمِ اسلام میں شعلہ حیات کبھی افسردہ نہیں ہوا لیکن اُٹھارہویں صدی میں تو اس نے کئی ایک ممالک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔''

ارشاد ہوا ''یوں جن تحریکوں کا ظہور ہوا ان میں ایک علاقہ سا قائم ہوگیا۔ حالانکہ اکثر و بیشتر ان میں باہم کوئی تعلق نہیں تھا بجز سطحی مشابہت کے، مثلاً یہی کہ جہاں کہیں بدعات کے خلاف کوئی آواز اُٹھی اسے بھی وہابیت سے تعبیر کیا گیا، حتیٰ کہ حضرت سیّد احمد کی تحریک جہاد بھی وہابی تحریک سے ہی موسوم ہوئی۔''

ہم نے عرض کیا آپ کے ارشادات کا مطلب گویا یہ ہے کہ وہابی تحریک تو آزادی اجتہاد کی تحریک تھی اور مقصد رد تقلید، غیر اسلامی تصورات اور بدعات کی آلائشوں سے اُمت کی تطہیر۔ اس کا مدعا تھا اصلاح جیسا کہ آپ نے خود بھی فرمایا ہے۔[۱۵]

فرمایا ''یہ درست ہے۔''

پھر ارشاد ہوا اور اب اشارہ تحریک جہاد کی طرف تھا ''کوئی بھی تحریک ہو اسے ناکامی اور ناکامرانی ہر طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تحریک جہاد کا ایک مرحلہ وہ تھا جو بالاکوٹ میں ختم ہوا[۱۶] دوسرا وہ جب یہ تحریک سرحد میں محدود ہوکر رہ گئی اور گو ۱۸۶۲ء کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں سست پڑ گئیں، بایں ہمہ حکومت کو ان کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہوا۔ اس تحریک کے بچے کھچے عناصر ہندوستان میں بھی موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی انگریزوں کے خلاف کوئی تحریک اُٹھی تو انھیں بھی موقع ملا کہ اپنی دعوت جہاد کو از سرِ نو

ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہم اپنے طریقِ زندگی کا تحفظ آپ کر لیں گے۔

ارشاد ہوا ''یونہی سہی لیکن کیسے؟ ازروے مفاہمت یا خانہ جنگی؟ مفاہمت کا خیال ہے تو اس کی ابتدا ابھی سے ہو جانی چاہیے۔ کیوں نہ اس جدوجہد کے لیے جو کل پیش آنے والی ہے ہم آج ہی اپنے آپ کو تیار کریں۔ کیوں نہ ہم آج ہی سمجھ لیں کہ آزاد ہندوستان میں اسلامی معاشرے کی تعمیر کن حالات میں ممکن ہوگی۔ ہمارا کوئی سیاسی اجتماعی نصب العین ہے تو کیا یہ لازم نہیں آتا کہ آزادی کی اس جدوجہد میں جو اس وقت درپیش ہے ہم اپنے مقاصد کا تعین اس نصب العین کے حوالے سے کریں۔''

ارشاد ہوا ''قوموں نے اس معاملے میں اکثر غلطیاں کیں اور نقصان بھی اُٹھایا کہ حالات کے غلط اندازے یا کسی خیال اور فرضی مصلحت کی بنا پر بعض باتوں کا فیصلہ ملتوی رکھا، حالانکہ یہ باتیں فوری طور پر فیصلہ طلب تھیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ ہمیں ان مسائل کا کوئی واضح تصور بھی نہیں جو کل پیش آنے والے ہیں اور جو اس ملک میں اسلامی معاشرے کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہیں۔ اب اگر ہندوستان میں آزادی کی وہی صورت ہوئی جو کانگریس کے سامنے ہے تو یہ حضرات کس کا اور کیسے تحفظ کریں گے۔''

ارشاد ہوا ''یہ سیاست اور اقتدار اور آئین وقانون کی بحثیں تو بڑی دقت طلب ہیں۔ علما حضرات اتنا تو سمجھیں کہ انگریز دشمنی کے جذبے میں اگر ہم نے وہی راستہ اختیار کر لیا جس پر کانگریس چل رہی ہے تو یہ راستہ مغرب کی لادین اور لااخلاق سیاست کا تو ہوگا کتاب وسنت کا نہیں ہوگا۔

ارشاد ہوا ''یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ مسلمان جب کبھی اپنے تصورات سیاست اور ملی نصب العین یا جداگانہ قومی وجود کے تحفظ کی بحث چھیڑیں تو اسے انگریزی اقتدار کی حمایت یا مفاد پرستی پر محمول کیا جائے۔ زور دیا جائے تو محض انگریز دشمنی پر۔ انگریز دشمنی کوئی مثبت اُصولِ سیاست نہیں ہے۔''

حضرت علامہ بڑے افسردہ خاطر تھے۔ انھیں بے حد رنج تھا کہ اس ساری کش مکش میں جو ایک طرف مسلمانوں اور حکومت اور دوسری جانب مسلمانوں اور ہندوؤں میں جاری ہے کانگریس کی حمایت اور عدم حمایت کو خواہ مخواہ فرقہ داری کا رنگ دیا جا رہا ہے حالانکہ مسلمانوں کا اختلاف وانتشار یا وہ مخصوص سیاسی صورتِ حالات جو سیاست حاضرہ نے آزادی اور اتحاد کے نام پر پیدا کر دی ہے اس میں ہماری فرقہ آرائیوں کی وجہ کچھ تو ہمارا زوال وانحطاط ہے، کچھ

زمانہ حال کے تصورات سیاست، دستور و آئین اور حکومت سے بے خبری کا۔ اس میں سنیت کو دخل ہے، نہ شیعت، نہ وہابیت کو۔''

ارشاد ہوا ''اگر اس کش مکش میں فرقہ داری کا رنگ پیدا ہوگیا تو یہ اَمر بڑا افسوس ناک ہوگا۔ ہر فرقہ اپنے لیے جداگانہ نمایندگی کا مطالبہ کرے گا۔''

ارشاد ہوا ''حکومت شاید چاہتی ہے کہ قادیانی اپنے لیے جداگانہ نمایندگی کا مطالبہ کریں جیسے سکھوں کو جو ہندو معاشرے ہی کا ایک جزو ہیں جداگانہ نمایندگی حاصل ہے۔

وقت بہت کافی گزر چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے حضرت علامہ آرام فرمائیں۔ علی بخش چائے لے آیا۔ حضرت علامہ نے قریشی صاحب کے کہنے سے کوئی دوا کھائی۔ پھر چائے پی۔ حقے کے دو ایک کش لیے اور تکیوں کا سہارا لیے کروٹ کے بل لیٹ گئے۔ علی بخش اور رحما بدن دابنے لگے۔ ہم چائے پی رہے تھے اور حضرت علامہ کے پاس خاطر سے کوئی نہ کوئی بات بھی کر لیتے۔ یہی ہمارا قومی انتشار، ہماری فرقہ بندیاں، ہمارا اختلاف نزاع کہ قریشی صاحب جو حضرت علامہ کے اور زیادہ قریب ہو کر ان کے ہاتھ سہلا رہے تھے کہنے لگے دراصل مولانا ابوالکلام کی ذات کانگریسی خیال علما کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

حضرت علامہ نے فرمایا: ''مولانا کے وہ کیا خیالات ہیں جن سے کانگریسی خیال علما کو سہارا مل رہا ہے؟''

عرض کیا گیا: ''یہی 'الدین' اور 'الاسلام' کی اصطلاحیں اور ان کے ماتحت وحدت ادیان کا تصور، علی ہذا ان کا یہ ارشاد کہ دین کی روح ہے حسن عمل۔ اختلاف جو کچھ ہے تحزب اور تشیع کا ہے، الگ الگ گروہ بندیوں، مسلک اور مشرب، بالفاظِ دیگر شرائع کا۔''

حضرت علامہ نے تکیوں کا سہارا لیا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ یوں بھی ان کے لیے دیر تک لیٹے رہنا ناممکن تھا، اِلّا یہ کہ نیند کا غلبہ ہو۔ انھوں نے حقے کے دو ایک کش لیے اور فرمایا:

''مسلمان بڑے سادہ ہیں۔ اس قسم کی تعبیریں قبول کر لیتے ہیں۔ وہ نہیں سوچتے مولانا کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا یہ کہ اسلام کی اس تعبیر کے پیشِ نظر جو انھوں نے 'الدین' اور 'الاسلام' کی شکل میں کی ہے مسلمان سیاست کو مذہب سے الگ رکھیں، اپنے لیے جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں، اس گروہ بندی میں شامل ہو جائیں جس کی بنا اشتراکِ وطن پر ہے اور یہ سب

قطعِ نظر اس تصور کے جسے ہندوستانی قومیت کے نام سے اُبھارا جارہا ہے، اس لیے کہ ادیان اصلاً سب ایک ہیں۔''

فرمایا: ''میں نہیں جانتا مولانا کا مافی الضمیر کیا ہے۔ لیکن اگر وہی کچھ جو میں سمجھا ہوں[۲۳] تو ان کے غور وفکر میں ایک تو وہی دلیل کام کر رہی ہے جس کا تعلق لا دین سیاست سے ہے اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ ریاست اور کلیسا میں تفریق کی جائے۔ دوسری مذہبی اور یہ پہلی سے بھی زیادہ خطرناک کہ ادیان سب ایک ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ دین فی الحقیقت کوئی اُصول اجتماع نہیں بلکہ ایک اخلاقی نصب العین، جس کی آرزو ہے کہ دنیا میں ہر کہیں خیر وصداقت کو تحریک ہو، شرافت اور نیکوکاری کا دور دورہ رہے۔ رہی انسانی روابط کی دنیا، یعنی معاشرے کی تاسیس اور نظم امور، سو اس کے لیے ہمیں کسی اور ہی اُصول کی تلاش کرنا ہوگی۔''

فرمایا: ''یہ اُصول کیا ہوسکتا ہے۔ یہی کوئی نسلی اور وطنی گروہ بندی، یا جہاں تک اس ملک کا تعلق ہے ''ہندوستانی قومیت'' جسے اگر قبول کرلیا گیا تو مسلمانوں کی حیثیت قوم کی نہیں، بلکہ ایک مذہبی گروہ کی رہ جائے گی۔ شریعت کی چند ذاتی اور شخصی قوانین، عقاید اور مراسم تک۔ یہ جو کچھ ہوگا، نہایت افسوسناک ہوگا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک ہمارا یہ فیصلہ کہ جہاں تک روح دین یعنی اس نصب العین کا تعلق ہے جو عالم انسانی کو خیر وصداقت، شرافت اور نیکوکاری کی دعوت دے رہا ہے اسلام میں اس کے حصول کا کوئی مخصوص اور متعین راستہ نہیں یہ مقاصد سیاسی اجتماعی حد بندیوں، انسانی روابط کی نئی نئی اساسات اور تہذیب وتمدن کے نشوونما کے باوجود دوسروں سے مل جل کر خود بخود پورے ہوتے رہیں گے۔''

فرمایا: ''یہ حد درجے کی خود فریبی ہے، بلکہ اسلام نافہمی۔ اسلام کے سامنے فرد اور معاشرے کا ایک مخصوص تصور ہے اور اس تصور کی عملی ترجمانی کا ایک متعین راستہ، یعنی شریعت۔''

فرمایا: ''یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ متحدہ قومیت کے باوجود جب مذاہب کا الگ تھلگ وجود بہرحال قائم رہے گا، گو بسبب وحدت ادیان کسی کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہوگی، جب بھی باعتبار سے ایک مذہبی تنظیم، یا باعتبار سے ایک سیاسی اقلیت کے وہ چھوٹی سی گروہ بندی، جو اس بڑی گروہ بندی کے اندر جسے ہم ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں قائم رہے گی، کیا اس کل سے متاثر نہیں ہوگی جس کا وہ ایک جزو ہے؟ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ بڑی

ہوا اور ترک دو مخالف گروہوں میں بٹ گئے۔''[۵۶]

فرمایا: ''وطنی قومیت اگرچہ اتحادِ اسلامی کے خلاف سب سے بڑا خطرہ ہے، لیکن افسوس ہے ترک خود ہی اس تحریک کا شکار ہوگئے جو ان کے خلاف اُٹھائی گئی تھی ان کا خیال تھا کہ دنیائے اسلام سے کٹ کر وہ اپنی جگہ اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔ پھر جب دورانِ جنگ میں عالمِ اسلام نے ان کی تائید میں کوئی آواز اُٹھائی، نہ عملاً اس سلسلے میں کچھ کیا، برعکس اس کے عین اس وقت جب انھیں امداد کی ضرورت تھی عربوں نے ان کے خلاف بغاوت کردی تو ان کے جذبۂ وطنیت میں اور بھی غلو پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کمال کمال پاشا سے اتاترک بنے اور انجام کار ان کی تقلید میں ہر کہیں اسلام کی تعبیر نسلی اور وطنی نقطۂ نظر سے ہونے لگی۔''

ارشاد ہوا: ''اسلام کا ایک بہت بڑا احسان یہ بھی تھا کہ اس سے مغربی ایشیا کا افتراق و انتشار اتحاد سے بدل گیا۔ جب تک یہ اتحاد قائم رہا مغرب کو اپنی ہوس استعمار اور جوع الارض کی تسکین کا کوئی راستہ نہ ملا۔ مگر افسوس ہے مسلمان خود ہی اس نکتے کو بھول گئے کہ ان کی جمعیت کا راز کیا ہے۔ انھوں نے اس اتحاد کو جس سے ان کی آبرو قائم تھی اپنے ہاتھوں آپ ہی پارہ پارہ کردیا۔''[۵۷]

حواشی

336

۱- جیسا کہ ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ جب سے حضرت علامہ سفرِ یورپ سے واپس آئے تھے انھیں یقین ہوگیا تھا کہ یورپ کے بارود خانے میں عنقریب آگ لگنے والی ہے اور پھر ایامِ علالت میں تو ان کا معمول ہوگیا تھا کہ اپنے ملاقاتیوں سے تقریباً ہر روز سوال کرتے ''جنگ کب ہوگی؟ آج کیا خبر ہے؟'' یوں بھی ان کا یہ ارشاد:

فرنگ رہگزرِ سیل بے پناہ میں ہے

ایک مستقل حقیقت کا حکم رکھتا ہے۔ ایک سیل گزر چکا ہے۔ دوسرا کب آئے گا؟

۲- روس کی بڑھتی ہوئی طاقت اور حلقۂ اثر نے گو اس اتحاد کا دائرہ محدود کردیا تھا، لیکن دوسری جنگ عظیم

کے مغرب کے یہ دو بازو (دایاں اور بایاں) پھر ایک دوسرے قریب ہو رہے، بلکہ ہو چکے ہیں۔

۲- امارتی (Aristocratic) نظام، بمقابلہ عوامی۔

۳- نیٹشے کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جن کا خیال تھا کہ یورپ کی سیاسی اور اجتماعی زندگی نے جو صورت اختیار کر رکھی ہے اس سے فرد اور جماعت کے اخلاق بہت بری طرح سے مجروح ہو رہے ہیں اور یہ اُمر خطرے سے خالی نہیں۔ اس کا نتیجہ ہوگا نزاع و جدال، جنگ اور ہلاکت۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے رنگ میں یورپ کو متنبہ کیا۔ نیٹشے نے اپنے نقطۂ نظر سے مارکس اور فرائیڈ نے اپنے نقطۂ نظر سے۔

۴- جیسا کہ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے موقع پر سب نے دیکھ لیا کہ یہ جو کچھ تھا ''تقسیم قبور'' کے بعد ''کفن دزدوں'' کی باہمی آویزش اور نزاع و پیکار کا لازمی نتیجہ۔

۵- Good Europeans

۶- اور جن سے متاثر ہو کر ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب لکھی: ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ کیا وہ وفادار ہیں؟

۷- اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث پرانی اصطلاحیں ہیں۔

۸- احیائے سنت کے پیشِ نظر۔ چنانچہ جب کبھی رائے نے اپنی حد سے تجاوز کیا، یا بدعات نے سر اُٹھایا اور تقلید پر زور دیا گیا تو بطور ردِ عمل حدیث سے رجوع لازم ٹھہرا۔ امام ابن تیمیہ اور ابن حزم کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ امام صاحب کا زمانہ ۱۳ویں صدی مسیحی ہے، ابن حزم ۱۱ویں۔

۹- شاہ ولی اللہ۔ شاہ صاحب اور امام محمد بن عبدالوہاب ہم عصر ہیں۔ ابن عبدالوہاب ۱۷۰۰ میں پیدا ہوئے۔ شاہ صاحب کوششوں سے مطالعہ حدیث کا دائرہ وسیع ہوا اور ہمیں معلوم ہے شاہ صاحب نے بخاری کے ساتھ موطا کے مطالعے پر بالخصوص زور دیا۔

۱۰- اس لیے کہ وہابی بالآخر دولتِ عثمانیہ سے ٹکرائے۔ باب عالی نے خدیو مصر کو ان کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا۔ وہابیوں کو شکست ہوئی اور مصری اپنی قوت کے بھروسے پر باب عالی سے متصادم ہو گئے۔ لہٰذا یورپ کو موقع ملا کہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دولتِ عثمانیہ کے معاملات میں دخل اندازی کریں۔ آلِ سعود کے سلسلہ میں موافقانہ تاکہ عربوں میں خانہ جنگی اور مذہبی اختلاف و نزاع کے علاوہ ترکوں سے ان کا رشتۂ مودت کٹ جائے۔ ہندوستان میں مخالفانہ۔ مثلاً حضرت سیّد احمد کی تحریک جہاد اور مجاہدین سرحد کے معاملے میں۔

337

۱۲- حضرت شاہ ولی اللہ۔

۱۳- بالخصوص ان کے عمرانی تصورات کی۔

۱۴- یہاں لفظ وہابی سے محض اس تحریک کا انتساب مقصود ہے۔

۱۵- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ چھٹا خطبہ۔

حاصل کر سکتے ہیں اور شاید ایک حد تک افغان بھی۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اتحادِ اتراک، یا اتحادِ عرب کی تحریک کسی نہ کسی رنگ میں اسلام کے لیے بھی مفید ٹھہرے، گو اسلام قاطعِ نسل و وطن ہے۔''

حضرت علامہ برابر گفتگو کیے جا رہے تھے۔ اِلّا یہ کہ بسبب ضعف و اضمحلال تھوڑی دیر کے لیے رُک جائیں۔ فرمایا: ''لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ تحریکیں کامیاب نہ ہوں، اس لیے کہ کسی نسل کا نہ تو خالصاً کہیں وجود ہے، نہ ان کی اندرونی گروہ بندیاں بآسانی ختم ہو سکتی ہیں۔ علاوہ اس کے کئی ایک اور بھی تو سیاسی اجتماعی عوامل ہیں جو دنیا میں ہر کہیں کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے ان عوامل کی بنا پر اس قسم کے نسلی اتحاد کی شدت سے مخالفت کی جائے۔''

پھر قدرے سکوت کے بعد فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے دنیا ایک بہت بڑے انقلاب کی منتظر ہے۔''[۳]

میں نے عرض کیا: ''بالفرض یہ تحریکیں کامیاب ہو جائیں تو اس صورت میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ آپ نے ابھی ارشاد فرمایا تھا اسلام قاطع، وطن اور نسل ہے۔''

فرمایا: ''یہ صحیح ہے۔ اسلام کوئی نسلی اور وطنی تفریق گوارا نہیں کرتا، لیکن نسلی اور وطنی گروہ بندی کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ مغلوبیت اور محکومیت آزادی اور استقلال سے بدل جائے۔ لہٰذا عربوں اور ترکوں نے اگر اس طرح قوت حاصل کر لی تو آئندہ چل کر یہ بھی ممکن ہے کہ بسبب اس دینی رشتے کے جو بجائے خود ایک سرچشمۂ اتحاد ہے وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں۔ یوں بھی اظہارِ ذات کی اس کوشش میں جس کا تعلق قومی عصبیت سے ہے جب ان کے ذہن میں کچھ اور زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو ہو سکتا ہے وہ سیاسی اور اجتماعی پہلو سے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ مسلمانوں کی گروہ بندی اسلام کی گروہ بندی ہے، یعنی ان کا ملّی اتحاد۔''[۴]

ہم نے عرض کیا: ''کچھ ایسا ہی خیال وطنیت پسند مسلمانوں کا ہے۔ کانگریس کی ہندوانہ ذہنیت کے پیشِ نظر ان کے تغلب پسند مقاصد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو ان کے ہم نوا یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک عارضی دور ہے، ہمارا حقیقی مقصد تو آزادی اور استخلاص ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک سب سے پہلا سوال یہی حصول آزادی کا ہے۔ باقی مسائل اندرونی ہیں۔ ہم ان مسائل سے بعد میں نپٹ لیں گے۔''

ارشاد ہوا: ''وہ کیسے؟ یہ سارا مسئلہ تو آئینی ہے، یعنی حکومت سے ایک بات منوانے کا۔''

پھر متاسف ہو کر فرمایا: ''مسلمان بڑے سادہ ہیں۔ کیسے کیسے مغالطوں میں گرفتار ہیں۔''

فرمایا: ''کانگریس کی حمایت سے تو مسلمانوں کے استخلاص اور آزادی کا راستہ نہیں کھلتا۔ یہ راستہ تو ضعف وانحطاط اور افتراق وانتشار کا ہے۔ طاقت اور قوت اتحاد وارتباط کا نہیں ہے۔ طاقت اور قوت حاصل ہوگی تو متحدہ قومیت یا کانگریس کی اصطلاح میں ہندوستانی قوم کو۔ آزادی بھی اسی کو ملے گی اور ہندوستان کا سیاسی اقتدار بھی اسی کے ہاتھ میں رہے گا۔ یہ راستہ آئینی جدوجہد سے طے کیا جائے، یا غیر آئینی طریقوں سے، دونوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا اکثریت کے حق میں ہوگا۔ اس لیے جب تک یہ طے نہیں ہوتا کہ جو لوگ اس جدوجہد میں شریک ہیں ان کی حیثیت بمقابلہ ایک دوسرے کے کیا ہے، یہ کہنا بہت بڑی غلطی ہوگی، بلکہ خود کشی کے مترادف کہ سرِدست مسئلہ صرف آزادی کا ہے۔ باقی مسائل بعد کے ہیں ہندو ایسے سادہ لوح نہیں ہیں جیسے اس خیال کے مسلمان انھیں سمجھتے ہیں۔''

ارشاد ہوا: ''دراصل یہ سارا فتنہ لفظ قوم کا پیدا کردہ ہے۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اصطلاح سیاست میں قوم کسے کہتے ہیں؟ اس سے مراد ہے کس طرح کی گروہ بندی؟ کانگریس کے نزدیک تو اس سے مراد وہ گروہ بندی جس کی اساس ہے وطن اور جس کے پیشِ نظر وہ اس ملک کے بسنے والوں کو ایک قوم سمجھتی ہے، حالانکہ اس خیالی اور فرضی یعنی ہندوستانی قوم کا سرے سے کہیں وجود ہی نہیں۔ ترک اور عرب یا افغان البتہ اس طرح کی ایک قوم ہیں جن میں وطنی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی اشتراک موجود ہے۔ ہندوستانی قومیت کا تصور کیجیے تو اس میں بجز ایک یعنی وطنی اشتراک کے کوئی قدر مشترک نہیں۔ لہٰذا اس طرح کے اشتراک وطن پر جو قوم بنے گی اس میں زمام اقتدار اکثریت یعنی ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔ ہم نے اس قومیت کو قبول کرلیا تو ہماری ہستی ہندوؤں میں ضم ہوجائے گی۔ لہٰذا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کانگریس جس قسم کی آزادی کی طلب گار ہے اور قوم کا جو تصور اس کے ذہن میں ہے اسے مان لیا جائے تو اس سے کیا نتائج مترتب ہوں گے۔ کیا اس صورت میں ہمارا تہذیبی اور اجتماعی تشخص قائم رہے گا؟''

فرمایا: ''ہندو اور مسلمان کبھی ان معنوں میں ایک قوم نہیں بن سکتے جن معنوں میں ترک اور عرب یا افغان ایک قوم ہیں۔''

لفظ قوم پر گفتگو ہونے لگی۔ ارشاد ہوا: ''جب سے مولانا حسین احمد نے لفظ قوم کے متعلق

ایک غیر ضروری اور سرتاسر لاحاصل بحث چھیڑی ہے قرآن اور حدیث اور عربی لغت کے حوالوں سے عجیب وغریب موشگافیاں پیدا کی جارہی ہیں۔ سوچتا ہوں مسلمانوں کا ذہنی انحطاط کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ دین کو جاننے اور دین کو سمجھنے کے دعویدار دین سے کیسے بے خبر ہیں۔ یہ کیسا سلسلۂ استناد واستشہاد ہے کہ قومیت کی حمایت میں اب اس آیت کا سہارا لیا جارہا ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَحْجُوْرًا[۵]

حالانکہ اس آیت میں قوم کا اشارہ اس گروہ کی طرف ہے جس میں رسول کی بعثت ہوئی۔ رسول کے پیشِ نظر جس طرح کی قوم ہے اسے اُمت کہا گیا ہے اور اس سے مراد ہے وہ سیاسی اجتماع جس کی تشکیل توحید ورسالت کی بنا پر ہوئی۔ قرآن مجید نے اس اجتماع کو قوم نہیں اُمت کہا ہے۔''[۶]

ارشاد ہوا: ''یوں بھی مولانا حسین احمد کے لغوی دلائل صحیح تسلیم کر لیے جائیں تو سیاستِ حاضرہ کی رُو سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ سیاسی لغت میں وطن اور قوم کے وہ معنی نہیں ہیں جو مولانا حسین احمد کے طرفدار اپنی سادگی سے سمجھ رہے ہیں اور جس کے لیے خوامخواہ عربی لغت، قرآن اور حدیث کے حوالے پیش کیے جارہے ہیں۔''

دفعتہً حضرت علامہ نے کچھ تکلیف محسوس کی اور سر تکیے پر ٹیک دیا حالانکہ دوران گفتگو میں ان کی طبیعت خاصی ہشاش بشاش تھی۔ ہم ابھی کچھ پوچھنے نہیں پائے تھے کہ انھوں نے پھر سر اُٹھایا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن کہہ نہیں سکے۔ سر پھر تکیوں پر ٹیک دیا۔ بڑی پریشانی کا عالم تھا۔ علی بخش اور رحما اُٹھ بیٹھے۔ قرشی صاحب نے آگے بڑھ کر نبض پر ہاتھ رکھا۔ اختلاج کا ہلکا سا دورہ تھا۔ حضرت علامہ کو ضعف محسوس ہو رہا تھا۔

قرشی صاحب اور آگے بڑھ گئے۔ کہنے لگے: ''خمیرہ استعمال فرمائیے۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

حضرت علامہ نے خمیرہ مروارید کی ایک خوراک کھائی اور اللہ کا شکر ہے کہ چند ہی لمحوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔

فرمایا: ''چائے پینے کو جی چاہتا ہے۔''

ہم قصداً خاموش بیٹھے تھے۔ ہمیں ایک گونہ اطمینان تھا۔ علی بخش چائے لایا تو ہم سب حضرت علامہ کے اور زیادہ قریب ہو بیٹھے۔ قرشی صاحب ان کے ہاتھ سہلانے لگے۔ حضرت

میں خواب گاہ میں داخل ہوا۔ حضرت علامہ کا مزاج پوچھا۔ فرمایا: ''الحمدللہ۔ آج دورہ نہیں ہوا۔ گو عوارض کا وہی حال ہے جو تھا۔''

اتنے میں حزب الاحناف کا وفد آ گیا۔ حضرت علامہ باوجود تکلیف کے بڑی مروت سے پیش آئے۔ وفد نے مزاج پرسی کی۔ سیاسی اور مذہبی حالات کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر استفسار کیا کہ بہ حالت موجودہ حزب الاحناف کو کیا کرنا چاہیے؟''

حضرت علامہ نے فرمایا: ''یہ موقع حنفی اور غیر حنفی کی بحث کا نہیں ہے، نہ فرقہ بندی کو ہوا دینے کا۔ فرقہ بندی کا یوں بھی کوئی جواز نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں میں دین کا فہم اور دین کی محبت پیدا کی جائے۔ یہ مقصد ایک حد تک قلم کے ذریعے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ حزب الاحناف اور نہیں تو اچھی قسم کی دینی کتابیں ہی شائع کرے۔''

ارکانِ وفد چند منٹ اور بیٹھے۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ انھوں نے اجازت لی۔ ارکانِ وفد گئے تو حضرت علامہ نے فرمایا: ''غنیمت ہے مسلمانوں میں کچھ احساس باقی ہے، لیکن یہ فرقہ بندی، یہ طرح طرح کے احزاب، یہ آئے دن کی جماعت سازی، اس سے کب نجات ملے گی؟ اگر اس جماعت سازی کی بجائے کوئی متحدہ کوشش کی جائے تو ممکن ہے حالات جلدی سدھر جائیں۔''

فرمایا: ''اتحاد ہی نہیں ہے، حالانکہ ہر کہیں اتحاد ہی کی ضرورت ہے۔ سیاست میں بھی، مذہب میں بھی۔''

پھر فرمایا: ''مسلمانوں کو چاہیے ملک برکت علی کے بل[1] کی حمایت کریں۔ معلوم نہیں اسمبلی میں کیا صورت پیش آئے۔''

قریشی صاحب آ گئے۔ مزاج پوچھا۔ فرمایا: ''الحمدللہ! طبیعت اچھی ہے۔ دن میں کوئی دورہ نہیں ہوا۔''

قریشی صاحب نے آگے بڑھ کر نبض دیکھی۔ کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ ہم[2] ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر کسی طرح حکیم صاحب تشریف لے آئیں۔''

حضرت علامہ نے چائے کے لیے کہا۔ علی بخش نے دوا کھلائی۔ پھر پائنتی کی طرف ہو کر بستر ٹھیک کیا، حضرت علامہ کو کمبل اوڑھایا اور باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

ارشاد ہوا: ''ایک رباعی ہے۔ اس کی تصحیح کر دو۔''

سلسلۂ گفتگو دوا کی طرف پھر گیا اور دوا سے دعا کی طرف۔

حضرت علامہ نے فرمایا: ''دعا کے بارے میں سرسیّد احمد خاں اور مرزا صاحب[۴] نے انتہا کر دی۔ سیّد احمد خاں پر تو علت و معلول کا خیال اس درجہ غالب تھا کہ اس وقت کے علوم طبیعی کے زیرِ اثر انھوں نے ''نیچر'' کا جو تصور قائم کیا اس کی رُو سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ حوادث کی ترتیب میں کوئی ردو بدل ہو سکے، یا ان سے وہ نتیجہ مترتب نہ ہو جس کا باعتبار علت معلول و مترتب ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ بار بار ''نیچر'' کا نام لیتے اور پھر اس کے اس حد تک قائل ہو گئے کہ انھوں نے سمجھا کائنات کے جملہ حوادث علت و معلول کی کڑی زنجیر میں اس سختی سے منسلک ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کا ظہور یقینی ہے۔ اب فرض کیجیے حادثہ الف رونما ہے اور یہ حادثہ کسی دوسرے مثلاً حادثہ ب کی علت ہے تو بحیثیت معلول حادثہ ب کا ظہور گویا پہلے سے متعین ہو چکا ہے، لہٰذا حادثہ وقوع میں آئے گا اور ضرور آئے گا۔ یہ ''نیچر'' ہے اور نیچر کی کارفرمائی رُک سکتی ہے، نہ اسے کوئی روک سکتا ہے۔ ''نیچر'' اپنا کام کرتا رہے گا[۵] حوادث کی ترتیب علت و معلول کی پابند ہے اور اس ترتیب میں ردو بدل ناممکن۔ یہ گویا اَمرِ ربی ہے۔[۶] یوں سرسیّد کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دعا سے بجز تسکینِ قلب اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مرزا صاحب تھے، جن کا کہنا تھا کہ دعا سے سب کچھ ممکن ہے۔ آپ دعا کرتے جایئے، جو چاہتے ہیں ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک بہت بڑا مسئلہ اس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی حادثے کی توجیہ یہ سمجھ کر کی جاتی ہے کہ وہ نتیجہ ہے قبولیت دعا کا تو ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا ہوگا۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ دعا نہ کی جاتی تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ اسے بہر کیف پیش آنا تھا، اس لیے کہ حوادث ماقبل کا رُخ اسی جانب تھا۔ لہٰذا پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ حوادث کی ترتیب میں کیا ردو بدل ممکن ہے؟ کیا دعا اس ترتیب کو روک سکتی ہے؟

میں نے عرض کیا: ''کیا حوادث کی کوئی ترتیب بھی ہے؟''

ارشاد ہوا: ''علت و معلول کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کی ایک ترتیب ہو، ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی۔''

بات آگے نہیں بڑھی۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنے اپنے طریق پر سوچ رہا تھا۔ مرزا صاحب نے انتہا کر دی۔ انھوں نے بات بات پر دعا کی اور ان سے بات بات پر دعا کی

درخواست ہونے لگی حالانکہ منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی ایک چیز تھی جس نے دلوں کو مرزا صاحب کی طرف کھینچا۔ یوں بھی دعا جزو ایمان ہے۔ ہم اللہ کو مانتے ہیں تو دعا بھی کریں گے اور کرتے رہیں گے۔ معلوم نہیں میرے رفقا کے احساسات حضرت علامہ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا تھے، لیکن میں نے سوچا حضرت علامہ کا مطلب شاید یہ ہے کہ دعا کی ضرورت اور تاثیر سے اگرچہ انکار ممکن نہیں لیکن دعا کا بھی ایک موقع و محل ہے، مناسبت اور عدم مناسبت، کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیوں؟[8] ہم اپنی آرزوؤں اور امیدوں، عزائم اور مقاصد، مسائل اور پریشانیوں، حالات اور مشکلات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے دعا کی اور اگر یہ دعا سن لی گئی تو وہی کچھ ہوگا جس کی ہمیں تمنا ہے۔ ہم نے اپنی طاقت اور اختیار کا رشتہ اپنے عجز و درماندگی سے کیسے جوڑا؟ ہم کیا سمجھے، ہم کسی بات کے اہل بھی ہیں، یا سرتاسر ہیچ؟ ہمارا ذہن رویہ اس باب میں کیا ہے، یعنی ہم نے کیا طے کیا؟ کیا دعا سے اعتماد ذات کو تحریک ہوتی ہے؟ وہ عزم و ہمت کا سرچشمہ ہے یا بے چارگی اور بے بسی کا مظہر؟ بعینہٖ یہ عالم اسباب، جہاں زندگی کا ایک اُصول اور قانون ہے اس میں ہماری سعی و محنت ہمارے وسائل اور ذرائع اور ہمارے اقدام و عمل کے کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں؟ ورنہ یوں مانگنے کو لوگ شب و روز دعائیں مانگتے، اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، مزاروں اور خانقاہوں کا رُخ کرتے اور پیروں فقیروں کا سہارا لیتے ہیں، جیسے سلسلہ اُمور کسی پراسرار قوت کے تابع ہے اور نفس انسانی اس کی نیرنگیوں کا آماجگاہ۔

میں کچھ اس طرح سوچ رہا تھا کہ حضرت علامہ نے فرمایا: ''وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق تو نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اسی سے کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھی سے دعا کرو۔ میں تمھاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں۔[9] زندگی کیا ہے؟ ایک مسلسل دعا!

363

حضرت علامہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ انھوں نے حقے کا کش لیا اور کروٹ بدلی تاکہ ستالیں۔ میرے ذہن میں کئی سوال پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن حضرت علامہ کا ذہن تو اب دعا کے عام مظاہر سے ہٹ کر اس کی حقیقت اور کنہ تک پہنچ چکا تھا۔ انسان کی ساری زندگی دعا ہے...... دعا، جو اللہ تعالیٰ کو قادر و مطلق، رب اور خالق اور سمیع و علیم مان کر صمیم قلب سے نکلتی ہے۔ دعا، جو عبادت ہے، ذکر ہے، صلوٰۃ ہے۔ دعا، جس سے زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا اور سیرت

حواشی

۱- شیخ عطا محمد مرحوم، حضرت علامہ کے برادر بزرگ، جو انھیں بے حد عزیز تھے۔ بانگ درا (التجائے مسافر) میں ہے:

وہ میرا یار بھی معشوق بھی برادر بھی

۲- مرحوم۔ اس وقت پروفیسر اور پھر تقسیم ملک کے بعد پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور۔

۳- پنجابی زبان میں صوفیانہ شاعری کے اصناف سخن میں سے ایک۔

۴- بانی سلسلہ احمدیہ

۵- اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ حضرت علامہ کے استاد محترم مولانا میر حسن کو سرسیّد علیہ الرحمۃ سے بڑا تعلق تھا اور علی گڑھ تحریک کی حمایت بھی انھوں نے بڑے شد و مد سے کی تھی۔ ان کے پاس ایک صاحب آئے اور کہنے لگے، حضرت والا کیا آپ بھی "نیچری" ہیں؟ آپ ہمیشہ سرسیّد کی حمایت کرتے ہیں۔ مولانا نے ان کے سوال پر کہا تو کچھ نہیں صرف اتنا پوچھا کہ آپ کے پاس کیا دیا سلائی ہے؟ انھوں نے کہا، ہے۔ فرمایا، ایک سلائی جلایئے اور یہ کاغذ کا ٹکڑا پاس رکھا ہے اسے دکھایئے۔ انھوں نے دیا سلائی جلائی کاغذ کے ٹکڑے کو دکھائی تو کاغذ جل اُٹھا۔ کہنے لگے، بس اس حد تک نیچری ہوں۔

۶- ورنہ علت و معلول کا تصور باطل ہو جائے گا، حالانکہ سوال اس تصور کے حق یا باطل ہونے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے تو ہم اس کی قدرت کاملہ کا رشتہ علت و معلول کی کارفرمائی سے کیسے جوڑیں؟ کیا اس کارفرمائی کی وہی نوعیت ہے جو علوم طبیعی کے مطالعے سے ہمارے ذہن میں آتی ہے، یعنی ابدی، مطلق اور غیر متبدل؟

۷- مثلاً تبلیغ اسلام، مذاہب غیر سے بحث و مناظرۃ اور اسلام کی حقانیت پر اصرار۔

۸- چاہنا تو کہیں رہا ایک وہ مقام بھی ہے جس کے بارے میں حضرت علامہ ہی نے فرمایا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور پھر مولانا روم کے اس ارشاد میں بہ ادنیٰ تصوف:

مرضیِ او در رضایش گم شود — ایں سخن کے باور مردم شود

۹- فَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُونِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ - ۴۰ (الغافر): ۶۰

مگر یہ مقام بھی کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ جاوید نامہ:

اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت — حرف ادعونی کہ گفت و با کہ گفت

۱۰- دیکھیے تشکیل جدید، خطبہ چہارم

حکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں، نہ اس کے ماضی، عہد بعہد ارتقا، انقلابات اور تغیرات کو، نہ اس میں قوموں کے حصے اور ان کے نقطۂ نظر کو۔ اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند ایک مستعار لیے ہوئے خیالات کا اعادہ۔''

فرمایا: ''حالانکہ مسلمانوں کو علم وحکمت میں سب سے پیش پیش ہونا چاہیے۔ ان کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابلِ فخر ہے۔ علم وحکمت کی کون سی شاخ ہے جس پر ان کی ذہانت، اجتہاد اور نبوغ کا نقش ثبت نہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں ''علمی روح'' پیدا کی اور علوم وفنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود، جسے آج کل سائنس کہتے ہیں، انھیں کا مرہونِ منت ہے۔''

فرمایا: ''ہم کیوں نہیں سمجھتے یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشوونما کا دارومدار ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ معائنہ، فکر ونظر، محسوس اور مرئی کا احترام، تجربہ، تحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل وتعبیر! یہ شرائط پوری نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا۔''[۱۲]

فرمایا: ''مسلمانوں کے زوال علم کی ذمہ داری محض سیاسی معاشی حالات پر عائد نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کا علمی زوال تو ان کے دورِ محکومیت سے بھی کہیں زیادہ متقدم ہے۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے زوال ہوا تو کیسے اور کیوں؟''

فرمایا: ''جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اہلِ جاپان کے یہاں کوئی علمی روایت نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے علم وحکمت میں کورے تھے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس میدان میں اس طرح آگے بڑھے کہ اہلِ یورپ کے مدمقابل بن گئے۔ مسلمانوں نے بھی تو کبھی اپنے اردگرد سے ...... اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دنیا معرض زوال میں تھی ...... علم وحکمت کا احتساب کیا تھا۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شان سے آگے بڑھے کہ علم وحکمت کی کائنات ہی بدل دی۔ علم کو صحیح معنوں میں علم کا درجہ عطا کیا۔ مسلمان آج پھر ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ مسلمانوں میں دم کیوں نہیں؟''

اور یہ کہتے کہتے افسردہ خاطر ہوگئے۔ ہم خاموش بیٹھے سوچ رہے تھے کہ ہماری ذہنی صلاحیتوں کو کیا ہوا۔ ہم میں وہ ذہنی تغیر کیوں پیدا نہیں ہوتا جس کی ایک مثال اگر جاپان سے

معاملات سے کہ پنجاب کی ایک بہت بڑی اسلامی ریاست ہے خاص دلچسپی ہے، لہٰذا ریاست کی باتیں ہونے لگیں۔ حضرت علامہ فرما رہے تھے: ''ریاست اور اہلِ ریاست کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ ہندوستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی کچھ اپنی فکر ہے کہ نہیں؟ ہندوستان میں جو آئینی تبدیلیاں ناگزیر ہیں ان کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ ریاست میں ابھی سے بعض باتوں کی پیش بندی کر لی جائے۔''

ارشاد ہوا: ''ریاست کا رقبہ نہایت وسیع ہے۔ چولستان آباد ہو جائے تو کیا خوب ہو۔ یہ بات کچھ مشکل تو نہیں، ہمت اور سمجھ کی ضرورت ہے۔''

سیّد صاحب اپنی معلومات کے مطابق حضرت علامہ کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ چولستان کی آبادکاری تو کیا اور بھی بہت کچھ ممکن ہے۔ حالات بھی بدل سکتے اور بدلے جا سکتے ہیں، لیکن ریاست میں دم نہیں۔

حضرت علامہ نے فرمایا: ''ریاست میں نہ سہی، اہلِ ریاست میں تو دم ہونا چاہیے۔ سیّد صاحب! بہاولپور مسلمانوں کی ریاست ہے۔ مسلمانوں کا گزر اس وقت سیاست کے ایک نہایت خطرناک مرحلے سے ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے آنکھیں کھولیں۔ ریاست نہیں تو اہلِ ریاست میں دم پیدا کیجیے۔ یہ موقعہ کچھ کرنے کا ہے۔''

سیّد صاحب ریاستوں کے مخصوص حالات، ریاستی باشندوں کی زندگی، ان کی قدامت پسندی اور پسماندگی کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے عمل دخل اور اربابِ ریاست کی مشکلات کا ذکر کر رہے تھے کہ علی بخش، جو باورچی خانے کی دیکھ بھال کر رہا تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا خواجہ وحید صاحب آئے ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ''باہر کیوں ٹھہرے ہیں، اندر آ۔'' علی بخش نے چلم ہاتھ میں لی اور باورچی خانے کا رُخ کیا۔

خواجہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ سلام عرض کیا۔ خیریت مزاج پوچھی اور ہمارے پاس رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ سیّد صاحب نے اجازت لی۔

حضرت علامہ نے فرمایا: ''خواجہ صاحب! کہیے، شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

خواجہ صاحب نے کہا: ''شہر میں تو بڑی زندگی ہے، مگر یونینسٹ پارٹی نے بڑا فتنہ پیدا کر رکھا ہے۔ اس پارٹی کی حالت تو ناقابلِ اصلاح ہے، لیکن اس سلسلے میں ہماری سب سے

میں نے عرض کیا، رہے اخباروں کے تبصرے سوان کی نوعیت محض سیاسی نزاع و جدال کی ہے، موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ لیکن یہ نہیں کہ کسی نے اس کے مضمنات کو سمجھا ہو، یا علمی، اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی لحاظ سے اس پر قلم اُٹھایا ہو۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ابھی تو آپ کے ارشادات سے بمشکل اس اَمر کا شعور پیدا ہوا ہے کہ اسلام ایک عمرانی تحریک، ایک نظام مدنیت اور ایک طریقِ زندگی بھی ہے ورنہ اسلام کے بارے میں عام خیالات تو وہی ہیں جو مذہب کے بارے میں عام طور پر ہوا کرتے ہیں...... وہی مذہب کا جواز اور مذہب کے سلسلے میں چند ایک مابعدالطبیعی مسائل، شریعت اور اس کی حدود و قیود، قانون اور اخلاق کی بحث...... وہی خانقاہیت اور ملائیت جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

پڑھے لکھے طبقے کا بھی یہ حال ہے کہ کبھی آپ کے خطبات کا مطالعہ کرتا ہے یا اس سے خطبات کے مطالعے کے لیے کہا جاتا ہے، ریاست اور مدنیت کے سلسلے میں آپ کے ارشادات پیش کیے جاتے ہیں تو وہ سمجھتا ہے جیسے آپ نے کوئی بڑے چنبھے کی بات کہی ہے۔ مسلمانوں کا شعور ملی ہنوز بڑا ضعیف ہے۔ کانگریسی خیال علما نے اس میں مزید اُلجھاؤ پیدا کر رکھا ہے۔

ارشاد ہوا: ''یہ شعور مستحکم ہوگا اور ضرور ہوگا۔ زمانہ سب کچھ سکھا دے گا۔ کوئی اُیچ پیچ رہے گا، نہ اُلجھاؤ، نہ شک وشبہات۔''

حضرت علامہ کا معمول تھا کہ کسی گہری سوچ میں ہوتے تو اکثر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے، ہاتھ پھیرتے۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہے تھے کہ مجھ سے کہنے لگے: ''کوئی خبر ہے؟''

میں نے عرض کیا، خبر تو کوئی نہیں۔

فرمایا: ''جرمنی میں کیا ہو رہا ہے؟''

میں کیا عرض کرتا۔ میں نے کہا خبر تو کوئی نہیں۔

حضرت علامہ بدستور کسی گہری سوچ میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے بہت بڑے انقلاب کے منتظر ہیں۔

...ہی تھی۔ اس اثنا میں حضرت علامہ نے کھانا تناول فرمایا۔ کوئی طبّی مرکب بھی استعما... کے دو ایک کش لیے، لیکن محض عادۃً ورنہ اب حقے میں کوئی لطف نہیں رہا تھا۔

دوشنبہ: ۲۱ر مارچ

کوئی گھنٹہ بھر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ بحمد للہ انھیں بہت شگفتہ خاطر پایا۔ علی بخش خوش تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا، رات کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب بڑے آرام سے سوتے رہے۔ قرشی صاحب نبض دیکھ گئے ہیں۔

۱۰ بج رہے تھے۔ میں نے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام عرض کیا اور مزاج پوچھا۔ فرمایا: ''بیان کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟ اخباروں کی کیا رائے ہے؟''

بیان سے مطلب تھا وہی بیان جو مولانا حسین احمد کے جواب میں لکھا گیا تھا اور کئی دن ہوئے روزنامہ احسان میں شائع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں حضرت علامہ کا ذہن بیان کی طرف کیسے منتقل ہوا۔ یوں بھی میں نے دیکھا حضرت علامہ کسی بڑی گہری سوچ میں ہیں جیسے عالمِ تخیل میں بہت دور کسی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا، بیان سے لوگ تو خوش ہیں اور یوں بھی ہر سمجھ دار آدمی نے اسے پسند کیا ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک تو یہ ایک بڑی قیمتی دستاویز ہے اور اسلام کے بارے میں آپ کے ارشادات کی تفصیل مزید۔ نوجوانوں کے ذہن میں بھی اب یہ بات آرہی ہے کہ اسلام اجتماع و عمران ہے۔ اس کی ایک اساس ہے، ایک عمود اور نصب العین۔ یوں انھیں کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں مسلمان ایک اُمت ہیں تو اس کا مطلب آج کل کی سیاسی اصطلاح میں یہ ہوگا کہ وہ ایک قوم بھی ہیں۔ اس قوم کا ایک اپنا مزاج ہے، ایک ہیئت اور ترکیب، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو وطنیت اور قومیت کے لادین تصورات سے محفوظ رکھیں، وہ تصورات جن کی بنا پر نام نہاد ہندوستانی قومیت کی عمارت اُٹھائی جارہی ہے اور [illegible] ایک طبقہ غلطی سے حمایت کر رہا ہے۔

لیگ کا عدم وجود برابر ہے۔ سرخ پوشوں کا زور ہے، مگر لوگ کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ کانگریس سے دب ضرور گئے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کچھ کریں تو کس کے بھروسے پر؟

حضرت علامہ مناسب جواب دے رہے تھے، لیکن حضرت علامہ کو زیادہ تر جستجو اس امر کی تھی کہ لیگ یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے متحدہ محاذ کی راہ میں عملاً کیا رکاوٹیں ہیں۔ کونسلر صاحبان اپنی دانست کے مطابق حالات پر تبصرہ کرتے رہے۔ گفتگو طول کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا گھر سے ہو آؤں۔ چودھری صاحب اور قریشی صاحب آتے ہی ہوں گے۔ م۔ ش موجود ہیں۔

گھر سے واپس آیا تو دس بج رہے تھے۔ معلوم ہوا قریشی صاحب جلدی آ گئے تھے۔ چودھری صاحب بھی موجود ہیں۔ راجا صاحب البتہ نہیں آئے۔ ان کا انتظار ہے۔ حضرت علامہ کی طبیعت بفضلہٖ تعالیٰ اچھی ہے۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ قریشی صاحب حضرت علامہ کے ہاتھ سہلا رہے تھے۔ م۔ ش بھی پلنگ کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ رحما بدن داب رہا تھا۔ چودھری صاحب شاید کوئی بات کر رہے تھے۔ میں نے حضرت علامہ کا مزاج پوچھا اور حسبِ معمول کرسی بڑھا کر پلنگ کے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت علامہ چودھری صاحب اور قریشی صاحب سے ڈاکٹر زیلتسر کا ذکر کر چکے تھے۔ مجھ سے تفصیل پوچھی گئی تو میں نے چودھری صاحب اور قریشی صاحب سے اپنی رائے کا اظہار کیا، یہ کہ زیلتسر علاج پر آمادہ ہیں، تشخیص مختلف ہے۔ کہتے ہیں صحیح دوائیں تجویز نہیں ہوئیں۔ انھیں اپنی دواؤں پر اعتماد ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی دواؤں کو آزمایا جائے یا نہیں؟ اس لیے کہ وہ بھی اگرچہ ایلوپیتھ ہیں، مگر ان کا طریق علاج رائج الوقت ایلوپیتھی سے اس قدر مختلف ہے کہ ہم ان سے رجوع کریں تو اول ان سب باتوں کو اچھی طرح سے سوچ لیں۔

طے پایا کہ سرِ دست علاج میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ ضرورت ہوئی تو ڈاکٹر زیلتسر سے پھر مشورہ کر لیا جائے گا۔

حضرت علامہ نے فرمایا: ''میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ علاج صرف طبّی ہوگا۔ یوں مشورے میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے طبّی ادویات پر زیادہ بھروسا ہے۔''

پھر ارشاد ہوا: ''طبّی علاج سیکڑوں برس کے تجربات پر مشتمل ہے۔ سیکڑوں برس سے طبّی ادویات آزمائی جا رہی ہیں۔ ان کی تاثیر اور فائدہ مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ انسانی

معلوم تھا ایمان زندگی ہے، طاقت ہے، قدرت ہے۔ جب تک مسلمان زندہ رہے اس نکتے کو خوب سمجھے، عام اور خاص، عالم اور جاہل سب ہی۔ یہ نکتہ علم کی سمجھ میں تو آتا ہے لیکن وہ اس کی تعبیر میں خود اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔"

شاید چودھری صاحب کہ رہے تھے، یا کہنا چاہتے تھے:

حکومت، بادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

پھر فرمایا "صبح مہر و سالک آئے تھے۔ جب تک بیٹھے رہے، یہی کوئی بیس پچیس منٹ، لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ان سے کہا ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے۔ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے۔ لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے سب اس میں شامل ہو جائیں، سب اس کو تقویت پہنچائیں۔ مسلمانوں کی زمام قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں رہے۔ ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔"

ارشاد ہوا "مگر یونینسٹ پارٹی کا ذہن صاف نہیں، نہ اس میں خلوص ہے نہ درد مندی۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ پارٹی آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی۔ اس کی ترکیب بڑے متضاد عناصر سے ہوئی۔ ہر عنصر کا اپنا ایک مفاد ہے۔ یہ ترکیب کب تک قائم رہے گی، یہ ترکیب قائم نہیں رہ سکتی۔"

باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت علامہ نے کچھ ضعف سا محسوس کیا۔ ارشاد ہوا ڈاکٹر حمید ملک کو بلایا جائے۔ قرشی صاحب نے آگے بڑھ کر نبض دیکھی۔ کچھ تدابیر کیں۔ عرق گل گاؤزبان کے ساتھ کوئی مرکب کھلایا۔ کہنے لگے دل کی تکلیف نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید ملک تو ملے نہیں۔ مگر تکلیف دور ہو گئی۔ حضرت علامہ پھر شگفتہ خاطر تھے۔

ارشاد ہوا یوسف حسین خان[12] کا خط آیا ہے۔ میں حکیم صاحب سے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ حسین خاں نے نسخہ بھجوا دیا ہے۔ حکیم صاحب[13] نے کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔

حضرت علامہ کے اس ارشاد پر کچھ پریشانی سی ہونے لگی۔ نسخہ بھجوانے کا مطلب یہ تھا کہ اب حیدر آباد سے دوائیں نہیں آئیں گی۔ ہدایات کا یہ کہ دوائیں کیسے تیار کی جائیں۔ کون کون سی دوا تیار ہونی چاہیے۔ ہم سوچ رہے تھے یہ دوائیں کیسے تیار ہوں گی۔ اِلّا یہ کہ قرشی صاحب ان کی تیاری کا اہتمام کریں۔ فرض کیجیے یہ اہتمام ہو جائے جب بھی حکیم صاحب کی خاص دوائیں

کیسے ملیں گی۔ یا شاید ایسا ہو کہ کچھ دوائیں لاہور میں تیار ہوں، کچھ حیدرآباد سے آجائیں۔

ہم اسی پریشانی میں تھے کہ قرشی صاحب نے کہا ان کی طرف سے بہرحال پوری کوشش ہوگی کہ حکیم صاحب کی ہدایات پر عمل ہوتا رہے۔ دوائیں بھی تیار ہوتی رہیں گی۔ نسخہ موجود ہے۔ ہم دواؤں کا اہتمام کرلیں گے۔

قرشی صاحب کی باتوں سے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ پھر بھی اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا کہ حکیم صاحب لاہور تشریف نہ لاسکے۔ حکیم صاحب لاہور آ بھی نہیں سکتے تھے۔ حکیم صاحب کی پیرانہ سالی، حیدرآباد کی دوری، حضور نظام کی ملازمت، نہ حکیم صاحب سفر کے قابل تھے، نہ حضرت علامہ۔ دوائیں البتہ آجاتی تھیں۔ یہ سلسلہ بھی تقریباً منقطع ہوگیا۔

حضرت علامہ مطمئن تھے۔ علی بخش مٹھی چاپی کررہا تھا۔ م۔ش پلنگ سے لگے بیٹھے تھے۔ دیوان علی اور رحما بھی آگئے اور پائنتی کی طرف ہوکر بیٹھ گئے۔ دیوان علی نے چودھری صاحب کے اشارے سے کوئی کافی چھیڑی۔ حضرت علامہ سنتے، محظوظ ہوتے۔ جبر وقدر ہماری شاعری کا عام موضوع ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے لہٰذا انسان مجبور محض ہے، بے بس ہے۔ اگر انسان کو قدرت اور اختیار حاصل ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے انکار کی نوبت آئے گی۔ حضرات صوفیہ، حکما اور متکلمین اسلام نے اس مسئلے میں خوب خوب بحثیں کی ہیں۔ حضرت علامہ نے ان سے قطعِ نظر کرتے ہوئے فرمایا شاعری کی بات اور ہے، تصوف کا مقام بھی کچھ اور ہے اور یہ مسئلہ بھی بجائے خود کچھ اور کہ انسان مجبور محض ہے یا اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے لیکن اس قسم کے طرزِ خیال سے انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کا کیا اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔

''فرمایا قوموں کے زوال میں اس قسم کے خیالات کو خوب فروغ ہوتا ہے، بلکہ اس قسم کے خیالات ہیں کہ ان کی اشاعت قوموں کے زوال وانحطاط کا سبب بنتی ہے۔''

ارشاد ہوا ''وہ چیز جسے ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے، کیا شیطان؟ مجھے تو یہ گوارا نہیں کہ اپنے گناہوں کی ذمہ داری شیطان پر رکھوں۔ شیطان کے وجود کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں۔ گناہوں سے بچیں گے ہم۔ ہمیں پر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ شیطان بھی گناہوں کی ذمہ داری انسان ہی پر ڈالتا ہے۔[۱۴] شیطان بھی تو گناہوں سے بیزار رہتا ہے۔''[۱۵]

ارشادات میں ان پر تبصرہ فرماتے اور سامعین اور مخاطبین کو دعوت فکر دیتے تو جی چاہتا کہ ان سے ایک کے بعد دوسرا سوال کیا جائے، وہ اپنے ارشادات کی مزید وضاحت فرمائیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔ معالجین بار بار کہتے کہ حضرت علامہ بہت کم گفتگو کریں، حضرت علامہ سے بہت کم گفتگو کی جائے۔ لہٰذا ان موقعوں پر جہاں حضرت علامہ بات کرتے کرتے رُک گئے، یا انھوں نے اسے سننے والوں کی معلومات اور فہم و فراست پر چھوڑ دیا کہ وہ اس کی تکمیل خود اپنے علم اور سمجھ کی بنا پر کرلیں وہاں حواشی کا اضافہ ناگزیر ہوگیا۔ مگر اسی اُصول کا لحاظ رکھتے ہوئے جو متن میں پیشِ نظر رہا، یعنی پھر حد درجہ اختصار و ایجاز کے ساتھ کہ کسی اَمر ضروری کی وضاحت، یا متن کی کسی عبارت کی تشریح میں راقم الحروف جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے اپنے خیالات اور معلومات کا نتیجہ ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے جو کچھ کہا حضرت علامہ کا منشا بھی فی الواقع وہی تھا۔ بایں ہمہ جب اس بیاض یادداشت کی طباعت جسے تصنیف کہیے یا تالیف، یا روزنامچہ مکمل ہو رہی اور اس کے اجزا یکے بعد دیگرے سامنے آرہے تھے تو راقم الحروف اور راقم الحروف سے بڑھ کر اس کے احباب نے محسوس کیا کہ حواشی کی طرح بعض مقامات میں متن کی عبارتوں میں بھی اختصار و ایجاز کا یہ عالم ہے کہ کسی اَمر کی وضاحت تو درکنار خود راقم الحروف جو کچھ کہنا چاہتا تھا ٹھیک نہیں کہہ سکا۔ ایجاز و اختصار ضروری تھا مگر اس طرح عبارت میں جو اغلاق پیدا ہوگیا ہے اس سے نہ صرف حرف مطلب خبط ہوگیا، بلکہ بعض مباحث بھی تشنہ رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ان کی وضاحت ضروری تھی۔ لیکن اب اس فروگزاشت کی تلافی یونہی ممکن ہے کہ جہاں کہیں کسی عبارت میں اغلاق، یا بے ربطی پیدا ہوگئی ہے اس کی وضاحت اس استدراک میں کردی جائے۔ پھر اس ضمن میں ایک رائے یہ بھی تھی کہ مسائل فلسفہ اور علم و حکمت، یا تہذیب و تمدن کے باب میں تو خیر مجبوری تھی، اسلام اور اسلامی تعلیمات، بالخصوص ہندی سیاست کے مسئلے میں تو حضرت علامہ نے جو ارشادات فرمائے قدرے تشریح طلب تھے۔ ان کے بیان میں کچھ تفصیل سے کام لیا ہوتا۔ اب جہاں تک ان حقائق کا تعلق ہے جن کی طرف حضرت علامہ کسی علمی مسئلے، یا اسلامی تعلیمات کے کسی پہلو کی وضاحت، یا افکار سیاست، یا کسی اور موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کوئی اشارہ فرماتے ان میں کیسی بھی تفصیل سے بات نہ بنتی، اس لیے کہ ان کی حیثیت بجائے خود مستقل مباحث کی ہے۔ لہٰذا ان پر

(ل) متن

ص۲، سطر۳

تو اس خیالی یا حقیقی خطرے کا ازالہ ہو سکے جو اندریں صورت اسے درپیش تھا۔

یعنی ملک کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے کہ بہ صورت انتقال اختیارات اگر سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی حکومت ان خطوں کی غالب اکثریت کو سونپ دی گئی اور یوں اس اسلامی ریاست کے قیام کا امکان پیدا ہو گیا جس کی تجویز حضرت علامہ خطبۂ الہ آباد میں کر چکے تھے تو جماعتِ احمدیہ کے لیے اس موقف پر قائم رہنا مشکل ہوگا جو از روے عقاید اسے اختیار کرنا پڑا اور جس سے مقصود تھا اُمت سے کاملاً ترکِ موالات، علیٰ ہذا اپنے جداگانہ مذہبی اور جماعتی تشخص پر اصرار۔ ظاہر ہے جماعتِ احمدیہ اب تا دیر اس روش پر چل سکتی تھی، نہ اس پر چلتے رہنا قرین مصلحت تھا۔ لہٰذا اس کی کوشش کہ جیسے جیسے حالات بدل رہے ہیں کوئی ایسا راستہ تجویز کرے جو اس کے جداگانہ مذہبی اور جماعتی تشخص کے عین مطابق ہو، مگر جس کے باوجود اکثریت سے مصالحت اور مفاہمت کی کوئی صورت بھی نکل آئے۔

ص۳، سطر۱

یعنی ان کی اس وحدت کا اعتراف

اس عبارت میں ان کی زائد ہے۔ جملہ یوں ہے یعنی اس وحدت کا اعتراف......

409

ص۵، سطور۳ تا۶

ان سطور کی صحت فرما لیجیے۔ عبارت قدرے بے ربط ہو گئی ہے صحیح عبارت یوں ہوگی:

......اور قومیں ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ یا ایک تہذیب دوسری پر چھا جاتی ہے......تم کے مخالف اور موافق اثرات کو، ایک کے لیے مخالف، دوسری کے لیے موافق

برعکس اس کے عقیدہ تناسخ کا حاصل اگر یہ ہے کہ موت ایک ایسا سانحہ ہے جس سے فرد کا احساس خودی اور تشخص ذات کالعدم ہو جاتا ہے، وہ کسی دوسری زندگی میں قدم نہیں رکھتا، نہ دوسری دنیا میں۔ قدم رکھتا ہے تو ایک سے دوسری جون میں۔ بہ الفاظ دیگر نئے سرے سے جنم لیتا ہے لیکن بغیر کسی احساس ذمہ داری کے اور بالکل لاشعوری طور پر، خواہ اس جون کا درجہ درجہ انسانیت کے برابر ہو، یا اس سے کم تر تو اس کے لیے ارتقا ہے، نہ انفرادیت، نہ کوئی ایسی شخصیت کہ دوام و ثبات کی اہل ہو۔ اسے تسلسل ذات کا شعور ہوگا، نہ یہ احساس کہ اس نے ایک مرتبہ حیات سے دوسرے میں قدم رکھا۔ تناسخ گویا خودی کا انقطاع ہے۔ ایک کے بعد دوسری خودی کا ظہور جس سے خودی کی حیثیت بجز ایک فریب کے زیادہ نہیں رہتی۔ ہندو فلسفہ میں جیو آتما کے تصور سے بھی قدرتاً یہی نتیجہ مترتب ہوتا ہے۔

ص ۱۰۵، مکرر آنکہ

راقم الحروف اس سے پہلے عرض کر آیا ہے کہ یہ جو ڈاکٹر عاشق بٹالوی نے اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال میں لکھا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو حضرت علامہ سے ملاقات کے لیے آئے تو اس وقت راجا حسن اختر اور میاں فیروز الدین احمد بھی جاوید منزل میں موجود تھے صحیح نہیں۔ بٹالوی صاحب نے راجا صاحب سے جو روایت منسوب کی تعجب خیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ روایت براہ راست انھیں نہیں پہنچی، پہنچی ہے تو وہ راجا صاحب کی بات ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھے۔ یا پھر انھوں نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا اور یہ نہیں سوچا کہ اس ملاقات کا حال جس طرح بیان کیا جا رہا ہے قابلِ قبول بھی ہوگا یا نہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی فروگزاشت ہے جو اس معاملے میں رہ گئی۔ بٹاولی صاحب نے راجا صاحب کے بیان کا حوالہ دیا ہے۔ راجا صاحب کوئی غلط بیانی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ان دنوں لاہور میں نہیں تھا۔ پھر یہ امر بھی کہ پنڈت جی حضرت علامہ سے ملاقات کے لیے آئے تو اس وقت کون جاوید منزل میں موجود تھا بس کچھ ایسا اہم نہیں تھا کہ اس کی تحقیق کی جاتی۔ جن حضرت علامہ کی موجودگی کے فی الواقع کوئی معنی تھے ان کی طرف خود حضرت علامہ نے اشارہ کر دیا تھا۔ لٰہذا حضرت علامہ نے اس ملاقات کا حال جس طرح بیان فرمایا میں نے اسے ویسے ہی قلم بند کر دیا۔ البتہ بٹالوی صاحب کی کتاب شائع ہوئی اور میری نظر سے گزری تو میں نے محسوس کیا کہ اس ملاقات کا

یہ صورت تھی پنڈت جی کی حضرت علامہ سے ملاقات کی۔ ضمناً اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شام کو دو ایک صوفے بھی حضرت علامہ کی خواب گاہ میں ڈال دیے گئے تھے تاکہ پنڈت جی اور ان کے رفقا بآرام ان پر بیٹھ کر حضرت علامہ سے گفتگو کر سکیں۔ ورنہ اس خواب گاہ میں حضرت علامہ کے پلنگ کے سامنے تین چار کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ بیٹھنے کا اور کوئی سامان نہیں تھا۔

ص ۱۹۶، پہلی تین سطریں

یہ دراصل اس صفحے کی آخری تین سطریں ہیں

ص ۲۰۳، سطر ۱۳

جاوید سنیما جا رہا ہے

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب مے لالہ فام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ وہی ہے جس کا حوالہ راقم الحروف نے دیا ہے۔

ص ۳۰۲، سطر ۱۲، ۱۳......

موضوعِ سخن یہ تھا اور معلوم نہیں کس نے چھیڑا کہ...... فطرت انسانی نے ستاروں سے بڑا اثر قبول کیا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا ذکر جنات کا تھا۔ کس نے چھیڑا اور کیسے، حضرت علامہ نے اس باب میں کیا فرمایا، پتہ نہ چل سکا۔ بجز اس کے کہ جنات سے سلسلہ گفتگو خوارق عادت اور خوارق عادت سے انسان کی اس خواہش اور کوشش کی طرف پھر گیا کہ عالم مادیات کی تسخیر کرے، ہواؤں میں اُڑے، ستاروں میں پہنچے۔

فضا میں اُڑنا تو اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ابن فرناس نے شاید سب سے پہلے یہ کوشش کی، اونچی (Leonardo da vinci) سے بھی پہلے کہ پر لگا کر فضا میں پرواز کرے۔ مگر ناکام رہا۔ ابن فرناس کا تعلق سرزمین اندلس سے تھا۔

رہا ستاروں میں پہنچنا، ان کی سیاحت کرنا سو جس طرح ابن عربی کی تحریروں سے ڈانٹے کو تحر... ئی کہ واقعتاً نہ سہی عالم خیال ہی میں ستاروں کا رُخ کرے، ابن عربی خود بھی تو افل...ت اور ستاروں میں اپنے مشاہدات کا حال بیان کر چکے ہیں۔ بعینہٖ صوفیہ اسلام

۲- سرسیّد اور علماے دیو بند...... متن ص ۲۸۳

اس عنوان سے ماہنامہ المعارف، لاہور کی اشاعت مارچ ۱۹۶۹ء میں پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی کے قلم سے ایک مختصر سا مضمون شائع ہو چکا ہے، بڑا دلچسپ اور اس قابل ہے کہ سرسیّد کے بارے میں علماے دیو بند نے خیالات کا اظہار کیا انھیں خاص طور پر پیشِ نظر رکھا جائے۔

عام خیال تو یہ ہے کہ سرسیّد کی سب سے زیادہ مخالفت علماے دیو بند نے کی اور دیو بند ہی کا مدرسہ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کا سب سے بڑا حریف تھا۔ گو بقول مولانا حالی ہندوستان کے دوسرے علماے کرام بھی ان کی زندگی ہی میں انھیں ملحد تصور کرنے لگے تھے۔ مگر علماے دیو بند نے کبھی ان پر الحاد اور بے دینی کا الزام نہیں رکھا۔ یہ علما کون تھے؟ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا رشید احمد گنگوہی' مولانا اشرف علی تھانوی۔

حاجی صاحب نے سرسیّد کے اخلاق عالیہ اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی از حد تعریف کی۔ بڑی نیاز مندی سے انھیں خط لکھا۔ کہا تو صرف یہ کہ سرسیّد قوم کی بہتری کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کر رہے ہیں محل نظر ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں (ان کے رسالہ تصفیۃ العقاید کا ذکر علماے سہارنپور کے سلسلے میں جنھوں نے سرسیّد کو کافر ٹھہرایا تھا اس سے پہلے آ چکا ہے) سرسیّد کی نیت اچھی ہے، عقل اچھی نہیں۔ پھر جب ان سے فتویٰ کفر پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا تم اس شخص کے خلاف دستخط کروانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی سے جب سرسیّد علی گڑھ کالج کے لیے امداد کے طالب ہوئے تو انھوں نے کہا اس کا فیصلہ مولانا محمد قاسم پر ہے۔ وہ جو کچھ کہیں گے ہم اس پر عمل کریں گے۔ انھوں نے گویا سرسیّد کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی بھی سرسیّد کے مخالف نہیں تھے۔ وہ صرف نئی تعلیم کے خلاف تھے۔ علی گڑھ کالج کو کالج نہیں فالج کہا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے سرسیّد کو کبھی کافر یا ملحد نہیں کہا۔

مگر پھر کیا خوب فرمایا مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی نے: سرسیّد کی تقریروں کو نہ دیکھو۔ ان کے قلب کو دیکھو کیا ہے۔ ایک مرتبہ حجرے سے باہر تشریف لائے اور مولانا محمد علی

مونگیری سے کہ ان کے خلیفہ تھے فرمایا مولوی لوگ اس بیچارے کو کافر بناتے ہیں۔ پھر اپنا وہی ارشاد دہرایا۔ اس کے قلب کو بھی تو دیکھو۔ انھوں نے گویا ایک صوفی صافی اور مرد باخدا کی طرح قلب کی تعریف فرمائی جس سے راقم الحروف یہی سمجھتا ہے کہ حضرت مولانا کے نزدیک سرسیّد کا قلب مومن کا قلب تھا۔

۳۔ شہید گنج...... متن ص، ۱۲۰

لاہور ریلوے اسٹیشن سے دہلی دروازے کا رُخ کیجیے اور بجاے دائیں ہاتھ کے بائیں ہاتھ کی سڑک پر چلتے جایئے تو سرائے سلطان کے بالمقابل آپ کو عین سڑک پر وہ عمارت ملے گی جسے سکھ گوردوارہ شہید گنج سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی گوردوارے کے احاطے میں وہ مسجد بھی واقع تھی جسے اس گوردوارے کی نسبت سے مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا اور جو ۱۹۳۵ء میں ۴ اور ۵ر جولائی کی درمیانی شب کو شہید کردی گئی۔

مسجد عہد شاہ جہانی میں تعمیر ہوئی۔ پاس ہی حضرت شاہ کاکو چشتی کا مزار ہے، یا تھا جو ابتدائی عہد مغلیہ کے ایک مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

بانی مسجد کا نام عبداللہ خاں ہے، سعید خاں بہادر ظفر جنگ کا بیٹا۔ سعید خان کو شاہ جہاں نے منصب دو ہزاری پر سرفراز کیا۔ کابل میں اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ رہ چکا تھا۔

عبداللہ خاں شاہزادہ داراشکوہ کا خان سامان تھا۔ پھر لاہور کا کوتوال بنا، مسجد متوسط درجے کی تھی، ایک اچھا خاصا بڑا احاطہ، کشادہ صحن، تین محرابیں، تین گنبد، عمارت پختہ۔ مسجد کے ساتھ ایک حمام بھی تھا۔

اسلامی حکومت کو زوال ہوا اور ۱۷۵۷ سے سکھ مثلوں نے پنجاب میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا تو بھنگی مثل کے تین سرداروں گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ نے ۱۷۶۵ سے ۱۷۹۹ تک کوئی ۳۴ سال لاہور کو بڑی بے دردی سے لوٹا۔ رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو جب بھی سکھ گردی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سکھ جس عمارت پر چاہتے تھے زبردستی قابض ہوجاتے، جسے چاہتے گراتے، یا اس میں توڑ پھوڑ کرتے۔ خود رنجیت سنگھ نے شالامار، شاہدرہ اور لاہور کی بڑی بڑی شاندار اور

ہوئی اور منظم کارروائی تھی جو کمال ہوشیاری سے سرانجام دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۴ اور ۵/ جولائی کی درمیانی شب میں شہید گنج کو مسلح فوج اور پولیس نے گھیر لیا۔ مسلمان بڑے بے بس تھے۔ سب سے زیادہ شرمناک اور قابلِ نفرین روش یونینسٹ پارٹی کی تھی، جس نے اسلامی مفاد کے تحفظ اور مسلمانوں کی نمایندگی کے دعووں کے باوجود اس موقعے پر ایسی چپ سادھ لی کہ شبہ ہونے لگا شاید اس کے بعض ارکان کی سکھوں سے ملی بھگت ہے۔ انھوں نے کمال بے غیرتی سے مسجد کو گرتے دیکھا اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ یہ صرف غیرت منداں لاہور تھے جو مولانا ظفر علی خاں کی قیادت میں شہید گنج پہنچ کر سکھوں کو اس حرکت سے روکنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دہلی دروازہ سے باہر قدم رکھا تو حکومت کی گولیاں ان کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ کتنے نوجوان تھے جنھوں نے اس روز جام شہادت نوش کیا۔ مولانا ظفر علی اور ان کے بعض ہمراہی گرفتار کر لیے گئے۔ لاہور کے بعض حصوں میں مارشل لا کی سی کیفیت تھی۔ اخباروں پر سنسر بٹھا دیا گیا۔ بایں ہمہ ۱۹۳۶ء تک مسلمان رضا کار شاہی مسجد سے نکلتے، شہید گنج کی طرف بڑھتے اور گرفتار ہو جاتے۔ مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو کوئی سی تصنیف، یا پھر ڈاکٹر عاشق بٹالوی کی کتاب اقبال کے آخری دو سال جس میں ۱۹۳۶ء سے لے کر مصنف نے ۱۹۳۸ء تک کے واقعات اجمالاً بیان کر دیے ہیں۔

مسجد شہید گنج کا انہدام جیسا المناک سانحہ تھا اس سے مسلمانوں کی غیرت ملی، عزت اور وقار کو جو ٹھوکر لگی اور وہ بھی اس صوبے میں جہاں ان کی اکثریت تھی، بلکہ کہنے کو حکومت بھی، اس پر ہر مسلمان کا دل تڑپ اُٹھا۔ حضرت علامہ کو اس حادثۂ الیمہ سے جو صدمہ پہنچا اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مسلمان کیسے کمزور ہیں، ان کی ذلت اور پستی کس حد تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں نفاق و افتراق رونما ہے۔ وہ زندگی سے کس قدر بیگانہ اور دین سے کس قدر دور ہٹ چکے ہیں۔ یہ اور قوموں کا زوال و انحطاط، افسردگی اور بے دلی، سیاست حاضرہ کی شیطنت اور فریب کاریاں اور یورپ کے ہاتھوں آدمیت کی رسوائی کتنے خیالات تھے کہ جب ان کا اظہار پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں ہوا تو اس مسجد کی یاد میں بھی انھیں بے اختیار کہنا پڑا:

مومناں را گفت آں سلطان دیں
مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں

انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ٹیلیفون پر بات کی تو معلوم ہوا کہ اصل اور ترجمہ دونوں غائب ہیں۔ کوئی صاحب اُڑا کر لے گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ملک صاحب کے پاس ایک فاضل نقل موجود تھی۔ مکرر ترجمہ ہوگیا۔ یہ ڈاکٹر عاشق بٹالوی کا بیان ہے۔ دیکھیے اقبال کے آخری دو سال، ص ۵۹۱۔

پھر چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ مسودہ مع ترجمہ سر سکندر کی خدمت میں پہنچ چکا ہے۔ کیسے اور کس کے ذریعے۔ یہ ایک راز سر بستہ ہے جو آج تک کھل نہیں سکا۔

ملک صاحب نے پنجاب اسمبلی میں اس مسودہ قانون کو پیش کرنے کا نوٹس دیا تو یونینسٹ پارٹی کے کچھ ارکان ان کی حمایت پر آمادہ ہوگئے۔ سر سکندر پریشان تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی وزارت کی کشتی ڈانواڈول ہو رہی ہے۔ مسودہ پیش ہوا اور انھوں نے اس کی تائید کی تو اسمبلی کے ہندو اور سکھ ارکان الگ ہو جائیں گے۔ تائید نہیں کرتے تو مسلمانوں میں ان کے خلاف جوش و خروش پھیل جائے گا۔ اسمبلی کے بعض ارکان بھی شاید ان کی پارٹی سے کٹ جائیں۔ بالآخر سر سکندر کی سیاست اور سرکار انگریزی کی دانشمندی ان کے آڑے آئی۔ انھوں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیں اور مسودے کو اسمبلی میں پیش ہونے سے روک دیں۔ اس اثنا میں وہ مسلمان ارکان اسمبلی کو بھی اپنا ہم نوا بنا چکے تھے۔ چنانچہ ۱۶ر مارچ کو انھوں نے اسمبلی میں بڑے وثوق اور اعتماد سے دھواں دھار تقریر کی۔ مسودہ قانون پیش نہ ہوسکا۔ گوردوارہ پر بندھک کمیٹی بھی حالات سے بے خبر نہیں تھی۔ ۱۱ر مارچ کو اس نے اعلان کر دیا کہ شہید گنج کے مسئلے پر آیندہ مسلمانوں سے کوئی گفت و شنید نہیں ہوگی۔ مسجد واگزار نہ ہوسکی۔

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ملک برکت علی جو مسودہ قانون اسلامی اوقاف اور مساجد کے تحفظ کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے سر سکندر نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے ملک صاحب کی کوششوں کو جس طرح ناکام بنایا اس پر مہاتما گاندھی تو انھیں مبارک باد دینے میں حق بجانب تھے۔ لیکن مولانا ابوالکلام نے بھی اس پر سر سکندر کو مبارک باد دی۔ کیوں اور کس لیے یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔

کسان شبانہ روز محنت کرتا، سختیاں جھیلتا، ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرتا اور یوں اپنی کھیتی کو اپنے خونِ جگر سے سینچتے باطمینان منتظر رہتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس کی محنت کا ثمرہ اس کے سامنے ہوگا۔ یہ بھی انتظار کی ایک کیفیت ہے، اعتماد، توقع اور یقین سے معمور۔

حضرت علامہ یہ فرما رہے تھے اور انتظار اور عدمِ انتظار کی اس بحث کے پیشِ نظر جو اسلام میں مجوسی تصورات کی درآمد سے پیدا ہوئی لیکن جس کی حقیقت کو بہت کم لوگ سمجھے میرا ذہن حضرت علامہ کے ان اشعار کی طرف منتقل ہوگیا:

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو
مجذوبِ فرنگی نے بانداز فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

بات آگے نہیں بڑھی۔ فرمایا انتظار کی مجوسی نفسیات نے بھی رفتہ رفتہ اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایک خاص شکل اختیار کی۔ زوال پذیر قوموں کو اس میں امید اور تسلی کی ایک جھلک نظر آئی۔ ہمیں معلوم ہے قیدِ بابل میں یہود اس طرزِ خیال سے بالخصوص متاثر ہوئے۔ انھیں داؤد نبی (علیہ السلام) کے پھر سے ظہور کا جس طرح انتظار رہا اس کو سب جانتے ہیں۔ یہود سے یہ خیال عیسائیوں میں پہنچا۔ مسیح علیہ السلام پھر دنیا میں آئیں گے۔ Millenium (الفی) کہ ان کا ظہور ایک ہزار سال کے بعد ہوگا عیسائی دنیا کا عام عقیدہ تھا۔

ارشاد ہوا ممکن ہے آج بھی ان کا کوئی فرقہ مسیح کی آمدِ ثانی کا قائل ہو۔ تحقیق کرنی چاہیے۔

۸- چولستان ...... متن ص ۳۷۷

چولستان یا دوسرے لفظوں میں صحرائے بہاولپور جس کا سلسلہ بالآخر راجستھان سے جا ملتا
زمانے میں بڑا آباد اور زرخیز علاقہ تھا۔ ۰۰۰,۱۳ ہزار مربع میلوں پر مشتمل۔ یہاں کبھی دریائے (گھاگرہ؟) بہتا تھا اور اس سارے علاقے کو سیراب کرتے ہوئے دریائے سندھ میں

جب نوعِ انسانی باہم دیگر مخالف اور متحارب گروہوں میں بٹ چکی ہو، جادۂ حق سے منحرف ہو جائے، طرح طرح کے باطل امتیازات اور خود ساختہ تفریقات پیدا کر لے، اس کا دل و دماغ تزکیہ طلب ہو، سیرت و کردار بے راہ تو جس اُمت نے صراطِ مستقیم کو پا لیا اور اس پر گامزن ہے وہ انسانیت کی تعمیر 'مِنْ دُوْنِ النَّاسِ' ہی کی بنا پر کرے گی۔ بظاہر دنیا سے الگ مگر بہ باطن اس کے ساتھ رہتے ہوئے تاکہ جہاں کہیں کوئی گروہ بندی قائم ہے اور جیسا کہ واقعہ ہے تا ہنوز اساساً غلط، اپنے اصل الاصول پر آجائے حتیٰ کہ یہ سب گروہ بندیاں ایک واحد اور عالمگیر گروہ بندی میں ضم ہو کر اس جمعیت بشری کی شکل اختیار کر لیں جو اسلام کا مقصود ہے اور جس کے بغیر نہ شر اور فساد کا ازالہ ممکن ہے، نہ اس اَمر کا کہ نوعِ انسانی کو صلح و امن اور اتحاد و اتفاق کی نعمت میسر آئے۔

۱۰- احمدیت، قادیانیت...... متن، ص ۸

ضرورۃ الامام ایک رسالہ ہے اور اس کا موضوع مرزا صاحب کا یہ دعویٰ کہ کوئی بھی زمانہ ہو امام کے وجود سے خالی نہیں رہتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس زمانے کا بھی کوئی امام ہو۔ امام کو پہچاننا اور ماننا ہر شخص کا فرض ہے ورنہ ایمان نامکمل رہتا ہے۔ وہ اس زمانے کے امام ہیں۔ ان کی ذات معیارِ امامت پر پوری اترتی ہے۔

بعینہٖ اس روایت کی بنا پر کہ ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کا ظہور ہوتا ہے تاکہ تجدیدِ دین کا فریضہ ادا ہوتا رہے، انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہی اس صدی کے مجدد ہیں۔ ان کے ہاتھوں دین کی تجدید ہوئی۔

پھر ارشاد ہوا حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو گئے۔ نہ بجسد عنصری آسمان پر اُٹھائے گئے، نہ قیامت کے قریب آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے۔ موعود ان کا آنا نہیں ہے بلکہ کسی ایسے انسان کا جو صفاتِ مسیحیت سے متصف ہو۔ یہ سب صفات ان میں موجود ہیں۔ وہ گویا مثیلِ مسیح ہیں۔ لہٰذا مسیح موعود۔

نزولِ مسیح کے ساتھ گو ظہورِ مہدی کا ذکر بھی آیا ہے۔ لیکن مسیح اور مہدی ایک ہی شخص کے دو نام ہیں جو استعارتاً اختیار کیے گئے۔ موعود مثیلِ مسیح کا آنا ہے، نہ کہ مہدی کا، لہٰذا مرزا صاحب مسیح موعود بھی ہیں اور مہدی مسعود بھی۔

مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے۔ مثیلِ مسیح کا بھی کم و بیش یہی درجہ ہونا چاہیے، بلکہ ہے۔ حقیقتاً نہ سہی مجازاً ہی سہی۔ لہٰذا مرزا صاحب بھی نبی ہیں۔ از روے عقیدہ نبی کہ مسیح موعود کی یہی شان ہے۔ از روے وحی نبی کہ انھیں مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ کا شرف حاصل ہوا۔ از روے بشارات اور نشانات نبی کہ ان کی آمد کی طرح طرح سے خبر دی گئی۔ ان کے ظہور کی پیشین گوئیاں موجود ہیں، ان کے دعاوی کی تصدیق ان کے الہامات سے ہوتی ہے، ان سیاسی، اجتماعی، جوی اور کوئی حوادث سے جو ان کی زندگی میں رونما ہوئے، ہو رہے ہیں اور آیندہ بھی ہوں گے۔ وہ نبی ہیں، لغوی اور اصطلاحی ہر لحاظ سے نبی۔

امامت اور مجددیت کے دعووں سے تو خیر اسلامی ذہن مانوس تھا۔ ان سے زیادہ تعرض نہیں کیا گیا۔ لیکن نبوت کا دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہیں تھا۔ اس دعوے کا اعلان ہوا تو اُمت بجا طور پر مضطرب ہو گئی۔ نبوت اور وہ بھی تیرہ سو برس کے بعد جب کہ اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ خاتم النبیین ہیں ختم ہو گیا۔ جب کہ عقیدہ یہ ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل اور ختمِ نبوت کے منافی ہے، اسلامی تعلیمات کے اساساً خلاف اور اُمت کے مقابلے میں ایک نئی اُمت کی در پردہ تمہید۔ لہٰذا اُمت نے مرزا صاحب کا دعویٰ قبول نہیں کیا۔ مرزا صاحب کے دعووں کا رد و ابطال ہونے لگا۔ رد و ابطال کی نوبت آئی تو جواباً کہا گیا کہ ختم نبوت کے یہ کہاں معنی ہیں کہ سلسلہ نبوت کلیتاً منقطع ہو گیا ہے۔ نبوت تو ایک انعام ہے۔ انعامات الٰہیہ کا سلسلہ کیسے منقطع ہو سکتا ہے۔ اس کی روح ہے وحی و الہام، مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اور سنت الٰہیہ کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ لہٰذا باب نبوت وا ہے، مسدود نہیں ہے جیسا کہ غلطی سے سمجھ لیا گیا۔ رہا عقیدۂ ختم نبوت سو اول تو یہ ثابت نہیں کہ اس عقیدے کو اگر فی الواقع یہ کوئی عقیدہ ہے عقیدے کی حیثیت حاصل تھی۔ فرض کیجیے تھی اور ہے تو جب بھی اس کے معنی وہ نہیں جس پر ان کے مخالف زور دے رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ منصب نبوت پر حضور رسالت مآب جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہر لگ چکی ہے۔ آپ نبیوں کی مہر ہیں۔ آخری نبی نہیں ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے۔ پھر قطعِ نظر اس اَمر سے کہ آپ سے پہلے جو انبیا مبعوث ہوئے ان کی نبوت پر بھی آپ کی مہر ثبت تھی نہیں۔ گو قرائن تو یہی کہتے ہیں کہ نہیں تھی اس لیے کہ مہر کی ضرورت پیش آتی ہے تو کسی چیز

کے اختتام پر، لہٰذا اس کا سلسلہ بھی انھیں ہاتھوں پر ختم ہو جاتا ہے جن میں مہر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نبیوں کی مہر ہی سہی، آپ کے بعد جو نبی آئے گا اس کی نبوت پر آپ کی مہر کیسے لگے گی؟ یوں کہ آنے والا نبی آپ ہی کی اُمت سے ہوگا۔ آپ ہی سے کسب فیض کرے گا۔ اس کی نبوت آپ ہی کی نبوت کا پرتو ہوگی۔ وہ آپ ہی کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کرے گا۔ لہٰذا خاتمہ ہوا تو تشریعی، نہ کہ غیر تشریعی نبوت کا۔ یوں نبوت کی ایک خاص شکل کا جواز پیدا ہوا تو اس کی تائید میں نئی نئی اصطلاحیں وضع کی گئیں: ’مثلاً افاضۂ محمدیہ‘ ظل اور بروز لہٰذا ظلی اور بروزی نبوت کے تصورات قائم ہوئے۔ انبیائے بنی اسرائیل کا حوالہ دیا گیا۔ انبیائے بنی اسرائیل سب اپنی اپنی جگہ پر نبی تھے۔ لیکن سب شریعت موسوی کے پابند، سب موسیٰ علیہ السلام کی اُمت۔ ارشاد ہوا کیا حدیث میں نہیں آیا کہ میری اُمت کے علما کی مثال وہی ہے جو انبیائے بنی اسرائیل کی۔ کیا محدث کو کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہوتا ہے نبی نہیں کہا گیا؟

مگر پھر نبوت خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو نبوت ہے اور نبی امتی ہو یا غیر امتی، ظلی اور بروزی، تشریعی یا غیر تشریعی بہر حال نبی۔ لہٰذا باعتبار منصب صف انبیا میں شامل۔ اس کا انکار سب انبیا کا انکار ہے۔ منکر نبوت کافر ہے۔ مرزا صاحب نبی ہیں تو ان کا منکر بھی کافر ٹھہرا۔ اُمت انکار کرتی ہے تو وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہوتی ہے۔ اب اس منطق سے اگر یہ منطق غلط نہیں دو نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ دونوں نہایت اہم اور اسلام اور اُمت دونوں کے لیے فیصلہ کن۔ ایک تو یہ کہ جس طرح اسلام عبارت ہے احمدیت سے اور دوسرا یہ کہ بعینہٖ اُمت عبارت ہے جماعتِ احمدیہ سے جس کا مرکز اب مرزا صاحب ہی کی ذات ہے ہم ان کی اطاعت پر شرعاً مکلّف ہیں۔ یہ اس لیے کہ احکامِ شریعت ہوں، یا کتاب وسنت کی ترجمانی اب اس کی وہی تعبیر قابلِ قبول ہوگی جو مرزا صاحب فرمائیں۔ فقہی اجتہادات بھی انھیں کے اجتہادات ہیں۔

یہ سلسلۂ استدلال واستشہاد آگے بڑھا اور اسلام ہر جہت اور ہر پہلو سے احمدیت میں محدود ہو کر رہ گیا تو مرزا صاحب اور مرزا صاحب کے متبعین اُمت سے دور ہوتے چلے گئے۔ دور ہوتے چلے گئے تو ایک نئی جماعت بندی اور نئی تنظیم ناگزیر ٹھہری۔ یہ تنظیم وجود میں آئی تو جماعتِ احمدیہ کا رشتہ اُمت سے کٹ گیا۔ اسلام اور کفر کی تعریف ایک نئے انداز میں ہونے لگے۔ اسلام جیسا کہ ۱۳سو برس سے لوگ سمجھتے چلے آرہے تھے اور خود مرزا صاحب بھی ویسے ہی

سمجھتے تھے، اس اسلام اور احمدیت کے درمیان ایک خط فاصل کھنچتا چلا گیا۔ یوں رفتہ رفتہ ایک نظام عقاید متشکل ہوا اور احمدیت کے نام پر ایک ایسی تحریک اُٹھائی گئی جو ہر میدان اور ہر معاملے میں اُمت کی حریف ٹھہری۔ یہ صورتِ حالات پیدا ہوئی تو جیسا کہ مرزا صاحب کے دعاوی اور احمدیت کے نام پر ایک نئی جماعت بندی کا تقاضا تھا بجا طور پر کہا گیا کہ اس اَمر کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ جماعتِ احمدیہ کیا اُمت کا جز ہے، یا اُمت سے باہر ایک نئی امت؟ ہے تو اُمت سے قطع تعلق، ترک روابط، بیدردی اور بے رخی کیوں؟ اگر اُمت کا جز نہیں تو کیوں نہیں اس کا اعلان کر دیا جاتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جماعتِ احمدیہ اُمت سے الگ بھی رہے اور اس میں شامل بھی۔ اُمت کی اساس تو رسالت محمدیہ پر ہے۔ اگر یہ اساس بجائے خود ناکافی ہے اور اُمت کا اطلاق صرف جماعتِ احمدیہ پر ہوتا ہے تو ختم نبوت کی وہ تاویل جو مرزا صاحب نے فرمائی غلط ٹھہرے گی۔ یہ تاویل اس اساس کے منافی ہے جس پر اُمت کا وجود قائم ہے۔ پھر جب اسلام کی بنا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے تو مرزا صاحب کی نبوت اور ان کے دعاوی کی تصدیق ایک اَمر زائد ہے جس کی از روے شریعت کوئی سند ہے، نہ جواز۔ یہ تو خیر اُصولی باتیں تھیں اور رفتہ رفتہ اُمت کے سامنے آئیں۔ اس لیے کہ احمدیت کا نشو و نما بھی رفتہ رفتہ ہوا، کچھ مرزا صاحب کی زندگی میں اور کچھ ان کے بعد۔ لیکن اس کی اُٹھان ہی اس طرح ہوئی تھی کہ اُمت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور بحث و نزاع کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو بعض صورتوں میں بڑا غیر ضروری تھا، بلکہ اصل بحث سے ہٹا ہوا۔ بحث یہ تھی کہ جماعتِ احمدیہ نے کیا باعتبار عقیدہ اور کیا باعتبار عمل جو روش اختیار کر رکھی ہے اس سے اُمت میں تفریق و انتشار رونما ہے، باہم آویزش اور تصادم کا خطرہ ہے۔ لہٰذا جماعتِ احمدیہ اور اُمت میں جو مسئلہ مابہ النزاع ہے اس کا کوئی قطعی اور آخری فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ مگر یہ سیدھا سادا سوال کئی ایک سوالوں میں اُلجھ کر رہ گیا جس کی ایک وجہ تھی اُمت کی صلح جوئی، دوسری جماعتِ احمدیہ کے ذہنی معہود کہ کوئی بات صاف صاف نہ کہے بر عکس اس کے موقع ہو، یا نہ ہو تعبیر و تاویل، بلکہ تاویل در تاویل سے کام لے لیں۔ لہٰذا اس سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا، نہ شاید کبھی مل سکے۔ اس لیے کہ جماعتِ احمدیہ نے اگرچہ اعتراض کا جواب اعتراض اور الزام کا الزام سے ، مگر کھل کر کچھ بھی نہیں کہا۔ اثبات ہے تو نفی اور نفی ہے تو اثبات کے ساتھ لہٰذا نتیجہ یہ کہ نصف

صدی سے زیادہ مدت گزر گئی۔ جماعتِ احمدیہ کے عقاید، جماعتِ احمدیہ کی جداگانہ تنظیم، جماعتِ احمدیہ کی تاویلات و تعبیرات اور جماعتِ احمدیہ کی اُمت سے بے تعلقی اور ترکِ موالات کی روش نے خود اس کے لیے جو مسائل پیدا کر رکھے ہیں ان میں کوئی ایک بھی حل نہ ہوسکا۔ کسی ایک کے بارے میں بھی کوئی آخری اور قطعی فیصلہ نہ ملا۔ اس کی وجہ ہے احمدیت کا ذہنی اُلجھاؤ، تذبذب اور تامل جس سے اس کا ایک فریق مستثنٰی ہے، نہ دوسرا گو دونوں اپنی اپنی اور جگہ پر مطمئن۔ چنانچہ یہ بھی ایک سبب ہے ان کے باہم گر نزاع اور بحث و جدال کا جس کا اظہار مرزا صاحب کے دعاوی، مرزا صاحب کے مرتبہ و مقام، نبوت اور ختم نبوت کے مسئلے میں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔

بہر حال یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ اول وہ سلسلۂ تصورات جس کی بدولت جماعتِ احمدیہ کے عقاید کا نشو و نما ہوا۔ گو راقم الحروف کے نزدیک عقاید کے نشو و نما کا یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے اور نہ معلوم کب تک جاری رہے۔ یہ تصورات کیا ہیں؟ امامت، مجددیت، مسیحیت، مہدویت، مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ، کشف و الہام، تشریعی اور غیر تشریعی نبوت، افاضۂ محمدیہ، ظل و بروز جن میں یہ سیدھی سی بات اُلجھ کر رہ گئی کہ دین مکمل ہو چکا۔ وحی الٰہی کا مقصد پورا ہو گیا۔ لہٰذا سلسلۂ رسالت و نبوت بھی ختم ہو گیا۔ اب نہ کسی کتاب کی ضرورت ہے، نہ رسول کی۔ نہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی نہ کشف و الہام، نہ ایسا کوئی دعویٰ حجت کہ اُمت اس کی تائید و تصدیق پر شرعاً مکلّف ہو۔ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار ہم ایک ہیں۔ ہمارا اللہ ایک ہے، رسول ایک، دین ایک، کتاب ایک۔ سب اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کے پابند، سب اس کے رسول کے متبع، اس کی اُمت۔ ہمارے لیے اب کوئی اور اطاعت ہے، نہ اتباع، نہ اس میں کسی توسط کی ضرورت ہے، نہ توسل کی۔ اُمت کی تشکیل ہو چکی۔ اس کی مرکزیت، اس کی وحدت اور جمعیت کا عمل مکمل ہو گیا۔ اب اس میں کسی اور جماعت بندی کا دخل ہے، نہ ایک اجتماع کے بعد دوسرے اجتماع کا جواز، نہ کبھی تھا، نہ ہو گا۔ یہ معنی ہیں ختم رسالت کے اور یہی راز ہے اُمت کے حفظ و استحکام اور ثبات و دوام کا۔ یہ یقین اور یہ اعتماد جس کو ساتھ لیے ہم اس راستے پر گامزن رہ سکتے ہیں جو از روے احکام الٰہیہ ہمارے لیے مجوز ہوا، جسے ہم صراط مستقیم سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے ہماری رہنمائی فرمائی اور جس کے ہوتے ہوئے ہم کسی دوسری رہنمائی کے محتاج ہیں، نہ کبھی ہوں گے۔ یہ ہے ہمارا ایمان۔ ہم اس پر قائم ہیں تو اس منصب کے اہل بھی ثابت ہوں گے جس کے لیے اُمت کی تشکیل ہوئی اور جس سے تقدیرِ عالم وابستہ ہے۔ یہ سیدھی سی بات تھی جو مسیحیت، مہدویت، امامت اور مجددیت کی لاحاصل اور لاطائل بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئی اور اُمت کو جو پہلے ہی سے فرقہ بندی کا شکار ہو چکی تھی ایک ایسے افتراق و شقاق کا سامنا کرنا پڑا جس سے اسلام ہی کے لیے کوئی مفید مطلب نتیجہ مترتب ہوا، نہ عالمِ اسلام کے لیے۔ پھر قطعِ نظر ان عقاید سے جو احمدیت کا تار و پود ہیں اور جن کی ایک تاریخ ہے، جن کی صحت اور عدم صحت سے عقلاً اور جواز و عدم جواز سے از روئے اسلام بحث کی جا سکتی ہے، یہ طے نہ ہو سکا کہ امامت سے مقصود اگر اُمت کی رہنمائی ہے تو اس رہنمائی کی ضرورت کب اور کیسے پیش آئی ہے؟ تجدید دین سے کیا مراد ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں اور نتائج کیا؟ یہ سب فرائض کیا پورے ہو گئے؟ نزول مسیح اور ظہور مہدی سے جو مقاصد وابستہ ہیں کیا ان کی تکمیل ہو چکی؟ قتل دجال اور کسر صلیب، حتیٰ کہ قتل خنزیر کی تعبیریں جیسا کہ احمدیت میں ان کا مفہوم ہے کیا صحیح نکلیں؟ کیسے اور کس رنگ میں؟ صحیح نکلیں تو وہ کیا انقلاب تھا جو اُمت کی اخلاقی اجتماعی جدوجہد، یا فکر و نظر میں رونما ہوا؟ کیا احمدیت نے احوال عالم سے مطابقت پیدا کرتے، ان کو سمجھتے اور ان پر تصرف حاصل کرتے ہوئے نوعِ انسانی کے دل و دماغ اور علم و عمل کا رُخ اس سمت میں موڑ دیا جو اسلام کا منشا ہے؟ حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ حالات اور واقعات کا کسے علم نہیں۔ ہم ان سے کیا نتائج اخذ کریں؟ کیسے مان لیں کہ احمدیت کا ظہور عبارت ہے اسلام کے غلبہ و فروغ سے۔ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے اور جماعتِ احمدیہ ہی فی الحقیقت اُمت کی قائم مقام!

ثانیاً اور یہ دوسری بات پہلی سے بھی اہم ہے۔ فرض کیجیے ہم جماعتِ احمدیہ کے عقاید سے تعرض نہیں کرتے۔ اُمت سے الگ تھلگ اس نے جو تنظیم قائم کر رکھی ہے اسے زیر بحث نہیں لاتے۔ ان دعاوی سے بھی قطعِ نظر کر لیتے ہیں جو احمدیت کے نام پر کیے گئے اور کیے جا رہے ہیں۔ مان لیا کہ احمدیت اسلام ہی کے اندر ایک تحریک ہے۔ اسے مسلمانوں سے کوئی پرخاش نہیں۔ لیکن ایک سوال ہے جو بار بار ہمارے ذہن میں اُبھرتا ہے اور جس کا تقاضا ہے کہ اس کا کوئی آخری اور قطعی جواب مل جائے۔ احمدیت کا سارا ذخیرۂ علم، ساری تصنیفات و

تالیفات، رسائل اور جرائد، چھوٹی بڑی تحریریں، اعلانات واشتہارات ہمارے سامنے ہیں۔ کیا ان سے اُمت کے اتحاد و استحکام اور اصلاح وترقی کا راستہ کھلا؟ مصاف حیات میں اس نے اپنا موقف صحت سے متعین کر لیا؟ اس جدوجہد کی کہ تقدیر عالمِ اسلام کے ہاتھ میں ہے ابتدا ہوگئی؟ پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ احمدیت نے اسلام کی جو تعبیر کی اس تعبیر سے بحیثیت ایک دین جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اسلام کی ترجمانی کیا تمام وکمال ہوجاتی ہے؟ ہم سمجھ لیتے ہیں اطیعواللہ اور اطیعوالرسول کے تقاضے کیا ہیں؟ احکامِ شریعت کا اطلاق جیسا کہ ان سے مقصود ہے فرد اور جماعت کی زندگی میں کیسے ہوگا؟ کیا یہ حقیقت ہمارے سامنے ہوگی کہ اسلام ایک ہمہ گیر تحریک ہے، قیدِ زمان ومکان اور نسل ووطن سے آزاد جس نے بطور ایک نظامِ حیات ریاست اور مذہب کو اس خوبی سے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے کہ سیاست ہو یا معاش، اخلاق یا قانون، یا عقاید اور اعمال زندگی کے چھوٹے بڑے سب معاملات ایک وحدت میں ضم ہو کر توحید ورسالت پر مرکوز ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہے نوعِ انسانی کی تقدیر اور مستقبل کے پیشِ نظر نظم اُمور میں مسلسل جدوجہد، مسلسل اقدام۔ یہ جدوجہد اور یہ اقدام جاری ہے تو اُمور عالم کا انتظام وانصرام بھی صحیح نہج پر ہوتا رہے گا اور ہم کہہ سکیں گے کہ بطور ایک تحریک اور بطور ایک نظامِ حیات اسلام فی الواقع اُمور عالم میں کارفرما ہے۔ ورنہ اس کی حیثیت محض ایک عقیدے، خیال اور تصور کی رہ جائے گی۔ لہٰذا سوال ہے احمدیت نے اسلام کی تعبیر جس رنگ میں کی کیا اس سے یہ حقائق واضح طور پر ہمارے شعور میں جاگزیں ہوجاتے ہیں؟ اس کا جواب ہے نہیں، ہرگز نہیں اور اس کی وجہ یہ کہ جماعتِ احمدیہ کی تنظیم کیسی بھی خوبی سے کی گئی، اس کا نظامِ جماعت کیسا بھی مظبوط، آپس کا ربط وضبط کیسا بھی قابلِ تعریف اور احمدی عقاید کی عملاً ترجمانی کا انداز کیسا بھی مؤثر اور کامیاب ہو یہ تو نہیں کیا جاسکتا کہ یہ نظامِ جماعت اس نظام کے ہم مرتبہ اور مترادف ہے جس کی اسلام نے تلقین کی، یا اس معاشرے کی تمہید جو اسلام کا مقصود ہے۔ بعینہٖ جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی کوششوں کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کی جائے عقاید کی تبلیغ اس دعوت کی تبلیغ تو نہیں ہے جو اسلام نے نوعِ انسانی کو دی اور جسے اول ہماری اپنی زندگی میں مشہود ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت علامہ نے خطاب بہ مبلغ اسلام در فرنگستان، یا اس نوع کی دوسری نظموں میں اشارہ کیا اور جن سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا

کہ تبلیغ اسلام کی کوئی بھی کوشش ہو، گو اپنی جگہ پر بڑی قابلِ ستایش، اس طرح کی کسی کوشش کے ساتھ یہ دیکھنا بھی تو ضروری ہے کہ حالات کیا ہیں۔ ہمارا خطاب کس سے ہے۔ وہ اپنی ذہنی اور اخلاقی، اجتماعی زندگی میں کیسے کیسے مراحل سے گزر رہے، یا گزر چکے ہیں۔ ہم ان کی زندگی میں جس تبدیلی کے خواہش مند ہیں اس کا جواز کیا انھیں ہماری اپنی زندگی سے مل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت علامہ کا یہ کہنا کیا غلط تھا:

زمانہ باز بر افروخت آتش نمرود
کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

گویا ہماری ذمہ داری صرف تبلیغ اسلام پر ختم نہیں ہو جاتی کہ زبان سے ایک بات کہہ دی۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اس کا جوہر آشکار ہو۔ خضرِ راہ میں ارشاد ہوا:

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

بالفاظِ دیگر وقت کا اصل تقاضا، یا نوعِ انسانی کی ضرورت تو یہ ہے اور تھی کہ ہم اپنے عمل سے جوہر اسلام آشکار کریں، اس امتحان میں پورے اتریں جو اس جدوجہد میں کہ عصر حاضر کا رُخ اسلام کی طرف مڑ جائے درپیش ہے اور جس کو دیکھتے ہوئے انھیں کہنا پڑا:

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

ہمیں معلوم ہے یہ قافلۂ سخت جاں ہنوز وقفِ اضطراب و کشمکش ہے۔ نہ معلوم کتنی منزلیں ہیں جن سے اسے ابھی گزرنا ہے۔ حضرت علامہ کے معترض ان حقائق کو تو سمجھے ہیں۔ برعکس اس کے ان کے ارشادات کو اعتراضات پر محمول کرتے۔ بعینہٖ حضرت علامہ کا فرمانا کہ جماعتِ احمدیہ کے سلسلۂ تعبیر و تاویل کی نوعیت سوئے ادب تک جا پہنچتی ہے غلط نہیں، گو یہ بات سمجھنے کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُمت کا اطلاق اگر فی الحقیقت جماعتِ احمدیہ ہی پر ہوتا ہے۔ احمدیت ہی حقیقی اسلام ہے، لہٰذا اسلام کا مستقبل بھی احمدیت ہی کے ہاتھوں میں، نیز ختم نبوت کی اس تاویل کو بھی جو مرزا صاحب نے فرمائی صحیح تسلیم کر لیا جائے، علیٰ ہٰذا ان کے دعویٰ مسیحیت و مہدویت اور نبوت کو، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ گزشتہ

۱۳۰۰ برس سے اسلام اور اُمت کا دور جس اساس پر قائم تھا نا کافی ہو چکی ہے۔ اب اسے ایک نئے توسط اور نئی اساس کی ضرورت ہے۔ اندریں صورت احمدیت کے ظہور کو کچھ ویسی ہی نظر سے دیکھنا پڑے گا جیسے اسلام کو۔ اسلام کا آنا ماضی کا ایک واقعہ ہوگا۔ اس کی جگہ احمدیت لے لے گی۔ یوں اس ظہور میں باعتبار مرتبہ و مقام اسلام سے جو مشابہت بلکہ مساوات پیدا ہو جاتی ہے اس سے جماعتِ احمدیہ کا ذہن احمدیت، بانی احمدیت، جماعتِ احمدیہ اور اس کے اکابر و اعاظم کے مرتبۂ دینی کی تعیین میں جس معیار سے کام لے گا یہ وہ تو نہیں ہوگا جس کا اطلاق افرادِ اُمت پر ہوتا ہے۔ وہ ان کے مرتبہ دینی و دینوی کو کسی اور ہی نظر سے دیکھے گی۔ جس ذہن میں نبوت، مسیحیت اور مہدویت کے عقاید کارفرما ہیں جو بہ سبب مرزا صاحب کے دعووں کے انبیا اور ان کے مویدین کو خواہ ان کا تعلق کسی زمانے سے ہو ہم مرتبہ گردانتا ہے وہ اس باب میں کیا کچھ مبالغے سے کام نہیں لے گا۔ بات طول کھینچ رہی ہے۔ یہاں صرف اس اَمر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جماعتِ احمدیہ کا اس باب میں حد سے بڑھا ہوا غلو کسی طرح بھی مناسب نہیں، بلکہ بڑھتے بڑھتے بڑی ناگوار شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یہ شذرہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا۔ لیکن راقم الحروف نے حضرت علامہ کے ان ارشادات کے پیشِ نظر جو اس بیاض یادداشت میں جماعتِ احمدیہ کے بارے میں بکھرے پڑے ہیں مناسب سمجھا کہ احمدی، یا قادیانی عقاید کا نشوونما جس طرح ہوتا رہا اور ان سے منطقی طور پر جو نتائج مترتب ہوئے، حتیٰ کہ اُمت کے اندر ایک نئی فرقہ بندی کا ظہور ہوا، تا آنکہ عملاً اس کا رشتہ اُمت سے کٹ گیا، یہ سب باتیں بطور پس منظر قارئین کے سامنے رہیں۔ یوں حضرت علامہ کے ارشادات کو سمجھنے میں یہی دو باتیں اُمت اور جماعتِ احمدیہ کے درمیان مابہ النزاع ہیں۔ ایک اُمت کی وحدت، اس کی جمعیت و مرکزیت اس کی اساس، منصب اور مقام کا تعیین، دوسری اسلام کی تعبیر بطور ایک عالمگیر انسانی دعوت کے جس کا تقاضا ہے ایک عالمگیر نظام اجتماع، ایک واحد اور خالصاً انسانی معاشرہ۔ ہمیں معلوم ہے اسلام نے اس تقاضے کو بدرجۂ اتم پورا کیا۔ ایک عالمگیر نظام اجتماع، ریاست اور معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ خلافت اسی ریاست اور معاشرے، یا دوسرے لفظوں میں اس عالمگیر نظام اجتماع کی تشکیل کو قائم رکھنے کا دوسرا نام ہے جس میں ہمارے فرائض اور ذمہ داریوں کا سلسلہ حیات فرد اور جماعت تک ہی

بات یہ ہے کہ جماعتِ احمدیہ (لاہوری اور قادیانی) ابھی تک نہیں سمجھی کہ اس کے عقاید، اس کی جماعتی تنظیم، تاویلات و تعبیرات سے بحیثیت ایک دعوت، بحیثیت ایک تحریک اور بحیثیت ایک نظام حیات اسلام اور اُمت کے لیے کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بااعتبار اپنے قول وفعل کے وہ بیک وقت مسلمانوں میں شامل بھی ہے اور نہیں بھی۔ شامل ہے نظری طور پر، شامل نہیں ہے عملاً۔ اب جہاں تک کسی معاشرے کے استحکام کا تعلق ہے۔ بالخصوص اسلامی معاشرے کا جس کی تشکیل ہی بنائے توحید ورسالت پر ہوئی یہ صورتِ حالات کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے جس سے اس کی اساس ہی متزلزل ہوجائے۔ لہٰذا حضرت علامہ چاہتے تھے جماعتِ احمدیہ خود ہی اپنے موقف پر غور کرے۔

دراصل حضرت علامہ جماعتِ احمدیہ کے مخصوص عقاید پر تبصرہ فرماتے بمقابلہ اُمت اس کی سیاسی روش زیرِ بحث آتی، کسی سیاسی جماعت، کسی مذہبی فرقے، یا اربابِ سیاست میں سے کسی کی طرف اشارہ کرتے تو اس نقطۂ نظر کے ماتحت جو انھوں نے ارض پاک و ہند کی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت، ان کے طرزِ عمل اور مستقبل کے بارے میں قائم کیا۔ ہمیں معلوم ہے اس نقطۂ نظر کا تعلق اسلام سے تھا، محض اختلاف مذہب وملت، یا کسی وقتی اور مقامی مفاد و مصلحت سے نہیں تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ ارض پاک و ہند میں دو آزاد ریاستیں قائم ہوں ایک ہندو، دوسری اسلامی۔ یہ دوسری، یعنی اسلامی ریاست اس لیے کہ بحیثیت ایک اجتماع اسلام نے نوعِ انسانی کے حفظ و استحکام اور مسلسل نشو ونما کے لیے ایک مخصوص نقطۂ نظر اختیار کیا۔ اسلام کی بصیرت یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا مستقبل جو اساساً ایک ہے اس عالمگیر معاشرے کے قیام واستحکام سے وابستہ ہے جس کا وظیفہ یہ ہے کہ بطور ایک سیاسی اجتماعی تنظیم کے ان احوال و ظروف پر نظر رکھے جو تہذیب و ترقی کے مساعد ہیں اور جن کے بغیر ناممکن ہے کہ فرد ہو یا جماعت اس کا قدم مراتب حیات میں آگے بڑھ سکے۔ لہٰذا حضرت علامہ کا ارشاد تھا کہ مسلمان اگر اس نکتے کو سمجھ گئے ہیں کہ اُمت ایک سیاسی اجتماعی ہیئت ہے۔ اگر انھیں معلوم ہے کہ دین عبارت ہے اس نظام حیات سے جو اس عالمگیر معاشرے کا مقوم اور صورت گر ہے لہٰذا اُمت اس کی تمہید تو دو خطرے ہیں جن کا سد باب ہوتے رہنا چاہیے۔ ایک اُصولی کہ اُمت کی اساس جس عقیدے پر قائم ہے اس کی تعبیر و تاویل میں کسی ایسی روش کو راہ نہ ملے جس سے اس کی

وحدت میں فرق آئے، یا جس سے اس کی مرکزیت اور جمعیت میں خلل پیدا ہو۔ بالفاظِ دیگر اُمت میں اُمت در اُمت یا نئی نئی گروہ بندیوں کا جواز نکلتا رہے۔ ایسا ہوا تو یہ اَمر اُمت کے دوام و استحکام کے منافی ہوگا۔ دوسرا خطرہ عملی ہے اور وہ یہ کہ بطور ایک نظام حیات اسلام عبارت ہے جس ہمہ گیری اور کلیت سے علی حالہ قائم رہے۔ ایسا نہ ہو ہم اسے محض ایک نظام اعمال وعقاید میں محدود کر دیں، حالانکہ اعمال وعقاید ہی وہ اساس ہے جس پر اسلام نے دین کی عمارت تیار کی اور دین کی غرض و غایت جیسا کہ ہمیں معلوم ہے یہ کہ زندگی کی ساری وسعتوں کو ہر پہلو اور ہر جہت سے سمیٹتے ہوئے ایک مخصوص و متعین نصب العین پر مرتکز کر دے جس کا حصول ظاہر ہے بجز ایک ہمہ گیر جدوجہد کے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہی جدوجہد ہے جسے ہم اقامت دین سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی ہمہ گیری اور کلیت میں فرق آ گیا، یا یوں کہیے کہ اس نے اجزائے حیات کی شیرازہ بندی جس تعمیری مقصد کے لیے کی قائم نہیں رہی تو اس کی وحدت لازماً اس ثنویت سے بدل جائے گی جسے دین و دنیا یا اصطلاحاً ریاست اور کلیسا کی تفریق کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ اَمر بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا۔ یہ دو خطرے تھے، ایک اندرونی، دوسرا بیرونی جن میں ایک طرف حضرت علامہ کا روئے سخن ان حضرات سے تھا، علما ہوں یا غیر علما جو دانستہ یا نادانستہ، یا کسی عارضی مصلحت کے خیال سے وطنی قومیت کا رستہ اختیار کرتے ہوئے دین کو مذہب کا مترادف قرار دے رہے تھے۔ دوسری جانب جماعتِ احمدیہ سے جسے مان لینا چاہیے کہ اُمت کی وحدت، مرکزیت اور جمعیت کا عمل ختم رسالت کی بدولت ہمیشہ کے لیے مکمل ہو گیا۔ اُمتِ اسلامیہ میں کہ نوعِ انسانی کی آخری گروہ بندی ہے اب کسی گروہ بندی کی خواہ اس کے لیے کوئی بھی عذر پیش کیا جائے گنجایش نہیں۔ گنجایش پیدا کی گئی تو یہ ایک نئی اُمت کی تمہید ہوگی جس سے نہ صرف اُمت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، وہ اس فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہے گی جس کے لیے اس کی تشکیل ہوئی، بلکہ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے کہ بحیثیت ایک دینِ اسلام کی دعوت کیا ہے، مقصود و منتہا کیا۔ حضرت علامہ چاہتے تھے جماعتِ احمدیہ اور نہیں تو اسی تفریق ہی سے سبق حاصل کرے جو محض 'خلافت' کے نزاع میں چند سال پہلے خود اس کی صفوں میں رونما ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ لے احمدیت کی تعلیمات میں اس اَمر کی گنجایش موجود ہے کہ اس کے اندر بھی کوئی ایسی گروہ بندی ظہور کرے جس سے

لفظ مترتب ...... مرتب کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

دوشنبہ: ۲۴/جنوری کا حوالہ نمبر ۲۵ غائب ہے؟؟؟؟

سہ شنبہ: ۸/فروری کا حوالہ نمبر ۲ غائب ہے؟؟؟؟

جمعرات: ۱۰/مارچ کا حوالہ نمبر ۲۲ غائب ہے؟؟؟

جمعرات: ۱۰/مارچ کا حوالہ نمبر ۴۵ غائب ہے؟؟؟

جمعرات: ۱۰/مارچ کا حوالہ نمبر ۴۹ غائب ہے؟؟؟

جمعرات: ۱۰/مارچ کا حوالہ نمبر ۵۰ غائب ہے؟؟؟

شنبہ: ۱۹/مارچ کا حوالہ نمبر ۶ غائب ہے؟؟؟

شنبہ: ۱۹/مارچ کا حوالہ نمبر ۱۱ غائب ہے؟؟؟

دوشنبہ: ۲۱/مارچ کا حوالہ نمبر ۱۷ غائب ہے؟؟؟